المزاح فی الکلام کالملح فی الطعام

گفتگو میں خوش مذاقی ایسی ہے جیسے کھانے میں نمک

زندگی زندہ دلی کا ہے نام
مُردہ دِل خاک جیا کرتے ہیں

لطائفِ عجیبہ

حصّہ دوم

جسمیں ایسے عجیب و غریب، نادر و برجستہ و دل خوش کن، پرلطف خوش مذاق اور پھڑکتے ہوئے لطائف ظرائف جمع کیے گئے ہیں جن کے پڑھنے سے دل باغ باغ اور فرطِ مسرت سے باچھیں کھل جائیں، خاطرِ ناشاد شاد اور غم غلط ہو جائے

مُرتبہ

خاکسار بشیرالدین احمد تعلقہ دار
حسب فرمایش مولوی منذر احمد صاحب بی۔ اے خلف الصدق مصنف

مرتبہ اول ایک ہزار ۱۰۰۰
قیمت عہ، خرچہ وی پی (۵،)
۱۳۴۳ھ
۱۹۲۵ء

صرف ٹائیٹل نور فائن آرٹ لیتھو پریس دہلی میں طبع ہوا

لطائفِ عجیبہ حصۂ دوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بعد حمدِ رب العالمین و نعتِ جناب سید المرسلین خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم وآلہ واصحابہ اجمعین۔ شائقین کلامِ لطیف کی خدمت میں عرض ہے کہ مزاح و مطایبہ اگر اعتدال سے ہو تو مزیلِ کلفت و باعثِ انبساط و فرحت و سببِ ازدیادِ دانش و بینش ہے

ہر نکتہ از و شگفتہ باغے * افروختہ تر زشب چراغے
لفظش چو طراوتِ معانی * معنیش چو آبِ زندگانی

اور حد سے بڑھ جائے تو بدنما اور داخلِ عیب ہے

لائقِ صحبت نہ باشد ہر کہ خندد بے محل * کفش چوں دنداں برآرد دور از پائی کنند

غرض مزاح کے دو رخ ہیں۔ افراط کا پہلو بیباکی اور تمسخر ہے۔

تفریطِ عبوست و گرفتگی اور وسطِ بشاشت و حسنِ معاشرت۔
دیباچہ اس کا ہم حصہ اول میں لکھ چکے ہیں جس میں (۴۶۰) لطیفے ہیں
حصہ دوم میں کسی طرح باقی ماندہ ذخیرے کی کھپت نہیں ہوسکتی۔ بہت
ممکن ہی کہ اسی سلسلے میں حصہ سوم بھی آگے چل کر نکلے۔ غرض یہ بات
ناظرین کے شوق پر موقوف و منحصر ہی اگر یہ دو حصّے نیک لگے تو
مجھے تیسرے حصّے کے مرتب کرنے کی جرأت ہوگی اور جو یہ ہی
ناقدردانی سے اینڈر رہ گئے تو پھر ہماری آپ کی کُٹّی۔ ؎

ہم بھی رکھتے ہیں وہ دل مول نہیں ہی جس کا
پر خریدار کی دیکھیں تو نظر کتنی ہی

حررہٗ البشیر

(۱) ایک روز میر مہدی مجروح بیٹھے تھے اور مرزا غالب[1] پلنگ پر پڑے کراہ رہے تھے۔ میر مہدی پاؤں دابنے لگے۔ مرزا نے کہا "بھئی تو سیّد زادہ ہے مجھے کیوں گنہگار کرتا ہے؟" انہوں نے نہ مانا اور کہا آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو پیر دابنے کی اُجرت دے دیجیے گا۔ مرزا نے کہا "ہاں، اس کا مضائقہ نہیں" جب وہ پیر داب چکے تو انھوں نے اُجرت طلب کی۔ مرزا نے کہا "بھیا کیسی اُجرت؟ تم نے میرے پاؤں دابے، میں نے تمہارے پیسے دابے، حساب برابر ہوا"

(۲ و ۳) ایک دن قبل غروبِ آفتاب مرزا صاحب شام کا کھانا کھا رہے تھے، اور کھانے میں صرف شامی کباب تھے۔ حالی وہاں موجود تھے اور رومال سے مکھیاں جھل رہے تھے۔ مرزا نے کہا "آپ ناحق تکلیف فرماتے ہیں، میں ان کبابوں میں سے آپ کو کچھ نہ دوں گا" پھر آپ ہی یہ حکایت بیان کی کہ نواب عبد الاحد خاں کے دسترخوان پر اُن کے مصاحبوں اور عزیزوں اور دوستوں کے لیے ہر قسم کے کھانے چُنے جاتے تھے مگر نواب صاحب کے لیے خاص ایک چیز طیار ہوتی تھی وہ اس کے سوا اور کچھ نہ کھاتے تھے۔ ایک روز اُن کے لیے مزعفر پکا تھا، وہی اُن کے سامنے لایا گیا۔ مصاحبوں میں ایک ڈوم بڑا منہ لگا ہوا تھا

[1] مرزا غالب کے اور لطیفے حصۂ اول میں ہیں۔ ۱۲

جو اُس وقت دسترخوان پر موجود تھا۔ نواب نے اُس کو کھانا دینے کے لیئے خالی رکابی طلب کی اُس کے آنے میں ہوئی دیر۔ نواب کھانا کھاتے جاتے تھے اور خالی رکابی بار بار مانگتے تھے۔ وہ مصاحب نواب سے آگے رومال ہلانے لگا اور کہا "حضور! اور رکابی کیا کیجیئے گا اب یہی خالی ہوئی جاتی ہے" نواب یہ فقرہ سُن کر پھڑک گئے اور وہی رکابی اُس کی طرف سرکا دی۔

(۴) مرزا ایک دن رات کو پلنگ پر لیٹے ہوتے آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تاروں کی ظاہری بے نظمی اور انتشار دیکھ کر بولے "جو کام خودرائی سے کیا جاتا ہے، اکثر بے ڈھنگا ہوتا ہے، ستاروں کو تو دیکھو کس ابتری سے بکھرے ہوئے ہیں ؟ نہ تناسب ہے نہ انتظام ہے، نہ بیل ہے نہ بوٹا ہے مگر بادشاہ خود مختار ہے کوئی دم نہیں مار سکتا"

(۵) ایک دن سید سردار مرزا مرحوم شام کو چلے آئے، جب تھوڑی دیر ٹھیر کر وہ جانے لگے تو مرزا خود اپنے ہاتھ میں شمع دان لے کر کھسکتے ہوئے لبِ فرش تک آئے تاکہ روشنی میں جوتی دیکھ کر پہن لیں۔ اُنھوں نے کہا قبلہ و کعبہ آپ نے کیوں تکلیف فرمائی ؟ میں اپنی جوتی پہن لیتا۔ مرزا نے کہا "میں آپ کو جوتی دکھانے کو شمع دان نہیں لایا، بلکہ اس لیئے لایا ہوں کہ کہیں آپ میری جوتی نہ پہن جائیں"

(۶) اگرچہ شاعری کی حیثیت سے مرزا نے شراب کی جا بجا تعریف کی ہی مگر اعتقاداً وہ اس کو بہت بُرا جانتے تھے۔ اور اپنے اس فعل پر سخت نادم تھے باوجود اس کے اُنھوں نے کبھی اپنے اس فعل کو چھپایا نہیں شراب کے متعلق مرزا کی ظرافت آمیز باتیں بہت مشہور ہیں۔ ایک صاحب نے مرزا کے سُنانے کو کہا کہ شراب پینی سخت گناہ ہی۔ آپ نے ہنس کر کہا بھلا جو پیئے تو کیا ہوتا ہی؟" اُنھوں نے کہا کہ اُدنیٰ بات یہ کہ دعا قبول نہیں ہوتی" مرزا نے کہا آپ جانتے ہیں شراب پیتا کون ہی؟" اول تو وہ کہ ایک بوتل اولڈ ٹام کی با سامان سامنے حاضر ہو، دوسرے بے فکری، تیسرے صحت آپ فرمایئے کہ جسے یہ سب کچھ حاصل ہو اور چاہیئے کیا جس کے لیے دعا کرے!"

(۷) مرزا صاحب ایک خط کو اس طرح شروع کرتے ہیں "بے مے کسی در کفِ من نامہ روانی۔ سرد ست ہوا آتش بے دود کجائی میر مہدی صبح کا وقت ہی، جاڑا خوب پڑ رہا ہی، انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہی۔ دو حرف لکھتا ہوں، ہاتھ تاپتا جاتا ہوں آگ میں گرمی سہی مگر وہ آتشِ سیّال کہاں کہ جب دو جرعے پی لیے فوراً رگ پے میں دوڑ گئی۔ دل توانا ہو گیا، دماغ روشن ہو گیا نفسِ ناطقہ کو تواجد ہم پہنچا ساقیِ کوثر کا بندہ اور تشنہ لب! ہائے غضب ہائے غضب!

(۸) میر مہدی مجروح نے جو پورے سے مرزا کو خط بھیجا اور وہاں جو کسی تقریب میں کئی سو من مصری کا شربت مہمانوں کے لیئے کیا گیا تھا اُس کا بھی ذکر لکھا، اُس کے جواب میں مرزا لکھتے ہیں۔

"میر احمد حسین اور قربان بیگ نامہ شمارا خواندا زوبہ ذوقِ شربت ہفت صد من نبات ہر دو را آب در دہن گشت سخن از بادۂ ناب نہ بود، ورنہ مرا نیز دل از جا رفتے"

(۹) غدر کے بعد جب کہ مرزا صاحب کی پنشن اور دربار دونوں بند تھے۔ پنڈت موتی لال میر منشی لفٹنٹی پنجاب مرزا صاحب سے ملنے کو آئے کچھ پنشن کا ذکر چلا مرزا صاحب بسبب دل شکستگی کے شکوہ و شکایت سے لبریز ہو رہے تھے، اثنائے گفتگو میں کہنے لگے

"عمر بھر میں ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر، اور ایک دفعہ نماز پڑھی ہو تو مسلمان نہیں، پھر میں نہیں جانتا کہ مجھے سرکار نے باغی مسلمانوں میں کس طرح شامل سمجھا ہے"

(۱۰) اگرچہ مرزا کا اصل مذہب صُلحِ کل تھا مگر زیادہ تر اُن کا میلانِ طبع تشیع کی طرف پایا جاتا تھا اور جنابِ امیر کو وہ رسولِ خدا کے بعد تمام اُمت سے افضل جانتے تھے۔ ایک بار بہادر شاہ بادشاہ نے دربار میں یہ کہا کہ ہم نے سُنا ہے کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب

شیعی المذہب ہیں۔ مرزا کو بھی اطلاع ہوگئی۔ چند رباعیاں لکھ کر حضور میں سُنائیں جن میں تشیّع اور رفض سے تحاشی کی تھی اُن میں سے ایک رباعی جو بہت لطیف ہی یہاں لکھی جاتی ہی۔ رباعی

جن لوگوں کو ہی مجھسے عداوت گہری ٭ کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری
دہری کیوں کر ہو جو کہ ہو وے صوفی ٭ شیعی کیوں کر ہو ماوراء النہری

دہریت اور تصوف میں جو بُعد ہی وہ ظاہر ہی۔ دہری خدا کے وجود ہی کا قایل نہیں اور صوفی صرف خدا ہی کو موجود جانتا ہی اور ماسوا کو ہیچ سمجھتا ہی پس صوفی دہری کیوں کر ہوسکتا ہی؟ چوتھے مصرع کا مطلب یہ ہی کہ ماوراء النہر یعنی ترکستان کے لوگ متعصب سنّی ہونے میں ضرب المثل ہیں یہاں تک کہ شیعہ اُن کو ناصبی اور خارجی سمجھتے ہیں چوں کہ مرزا کی اصل ماوراء النہر سے تھی اِس لیئے کہتے ہیں کہ ماوراء النہری رافضی یا شیعی کیوں کر ہوسکتا ہی؟۔

(۱۱) ایک روز سلطان نظام الدین قدس سرہٗ اور امیر خسرو کی خصوصیت کا ذکر دربار میں ہو رہا تھا مرزا نے اُسی وقت یہ شعر انشا کرکے سراج الدین بہادر شاہ کے سامنے پڑھا ؎

ملے دو مرشدوں کو قدرتِ حق سے ہیں دو طالب ٭ نظام الدین کو خسرو سراج الدین کو غالب

(۱۲) رمضان کا مہینا تھا ایک سنّی مولوی مرزا سے ملنے کو آتے اعصر

کا وقت تھا۔ مرزا نے خدمت گار سے پانی مانگا۔ مولوی صاحب نے
تعجب سے کہا کیا جناب کو روزہ نہیں ہے؟ مرزا نے کہا سنی مسلمان
ہوں، چار گھڑی دن رہے سے روزہ کھول لیتا ہوں۔
(۱۳) تفضل حسین خاں مرحوم خلفِ دیوان فضل اللہ خاں سے
مرزا صاحب نے اپنا دیوان مانگا اور اقرار کیا کہ میں اس کو دیکھ کر واپس
کر دوں گا، انھوں نے دیوان کو دینے سے انکار کیا اُن کے انکار کے
جواب میں مرزا لکھتے ہیں "کیوں صاحب! یہ چچا بھتیجا ہونا اور شاگردی
اور اُستادی سب پر پانی پھر گیا؟ اگر کوئی ہزار پانسو کی چیز ہوتی
اور میں تم سے مانگتا تو خدا جانے تم کیا غضب ڈھاتے۔ میرا کلام!
خرید آٹھ دس روپئے کی۔ سو وہ بھی میں یہ نہیں کہتا کہ مجھ کو دے
ڈالو۔ تم کو مبارک رہے مجھ کو مستعار دو، میں اس کو دیکھ لوں،
جو میرے پاس نہیں ہے اس کی نقل کر لوں پھر تم کو واپس بھیج دوں گا
اس طرح کی طلب پر نہ دینا دلیل اس کی یہ ہے کہ مجھ کو جھوٹا جانتے
ہو، میرا اعتبار نہیں، یا یہ کہ مجھ کو آزار دینا اور ستانا بدل منظور ہے
وہ کتاب ابھی میرے آدمی کو دے دو۔ باللہ و اللہ میں اس میں سے
جو میرے پاس نہیں ہے نقل کر کے بھیج دوں گا اگر تم کو واپس نہ دوں تو مجھ پر
لعنت اور اگر تم میری قسم کو نہ مانو اور کتاب حاملِ رقعہ کو نہ دو تو تم کو آفریں"۔

(۱۴) ایک خط میں **مرزا نواب علاؤ الدین خاں** کو لکھتے ہیں۔
"بدستِ مرگ وے یدتر از گمانِ تو نیست" مکرر لکھ چکا ہوں کہ قصیدہ
کا مسودہ میں نے نہیں رکھا، مکرر لکھ چکا ہوں کہ مجھے یاد نہیں
کون سی رباعیاں مانگتے ہو؟ پھر لکھتے ہو کہ رباعیاں بھیج! قصیدہ
بھیج! معنی اس کے یہ کہ تو جھوٹا ہے، اب کے تو مقرر بھیجے گا۔ بھائی
قرآن کی قسم، انجیل کی قسم، توریت کی قسم، زبور کی قسم، ہنود کی
چار بید کی قسم، دساتیر کی قسم، ژند کی قسم، پاژند کی قسم، گرنتھ
گرنتھ کی قسم، (اور نہیں[1] ہوتا تو تمہاری قسم اور کیا ہوتا) نہ میرے پاس
وہ قصیدہ نہ مجھے وہ رباعیات یاد۔ کلیات کے بارے میں جو عرض
کر چکا ہوں ع برہمانیم کہ ہستیم و ہماں خواہد بود۔

(۱۵) بعض اوقات ایسی فرمائشوں سے جن کے سر انجام کرنے میں **مرزا
صاحب** کو دقت اٹھانی پڑتی تھی بڑے لطف کے ساتھ پہلو بچاتے
تھے۔ یہ بات معلوم ہے کہ مادہ تاریخ نکالنے سے وہ ہمیشہ گھبراتے
تھے۔ ایک بار نواب **علاؤ الدین خاں** مرحوم نے اپنے لڑکے
کی ولادت کی تاریخ اور اس کے تاریخی نام کی فرمائش کی اس کے
جواب میں لکھتے ہیں: "شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے،
طریق صید افگنی سکھاتا ہے، جب جوان ہوتے ہیں آپ شکار کر کھاتے ہیں

[1] یہ جملہ میرا ہے۔ ۱۲ شبیر

تم سخنور ہو گئے، حسنِ طبع خداداد رکھتے ہو، ولادتِ فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو؟ اسمِ تاریخی کیوں نہ نکالو؟ کہ مجھ پیرِ غم زدہ، دل مردہ کو تکلیف دو۔ علاؤ الدین خاں! تیری جان کی قسم!! میں نے پہلے لڑکے کا جو اسمِ تاریخی نظم کر دیا تھا اور وہ لڑکا نہ جیا۔ مجھ کو اس وہم نے گھیرا ہے کہ وہ میری نحوستِ طالع کی تاثیر تھی، میرا ممدوح جیتا نہیں **نصیر الدین حیدر** اور **امجد علی شاہ** ایک ایک قصیدے میں چل دیئے، **واجد علی شاہ** تین قصیدوں کے متحمّل ہوئے، پھر نہ سنبھل سکے۔ جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے وہ عدم سے بھی پرے جا پہنچا۔ نا صاحب دُہائی خدا کی، میں نہ تاریخِ ولادت کہوں، نہ نامِ تاریخی ڈھونڈوں گا۔

(۱۶) جاڑے کے موسم میں ایک دن طوطے کا پنجرا سامنے رکھا تھا۔ طوطا سردی کے سبب پروں میں مُنہ چھپائے بیٹھا تھا۔ مرزا نے دیکھ کر کہا "میاں مٹھو! نہ تمہارے جورو نہ بچے، تم کس فکر میں یوں سر جھکائے بیٹھے ہو؟"

(۱۷) ایک دفعہ مرزا مکان بدلنا چاہتے تھے۔ ایک مکان آپ خود دیکھ کر آئے، اُس کا دیوان خانہ تو پسند آگیا مگر محل سرا خود نہ دیکھ سکے۔ گھر پر آکر اُس کے دیکھنے کے لیئے بی بی کو بھیجا۔ وہ دیکھ کر

آئیں تو اُن سے پسند ناپسند کا حال پوچھا۔ اُنھوں نے کہا "اس میں تو لوگ بلا بتلاتے ہیں" مرزا نے کہا "کیا آپ سے بھی بڑھ کر کوئی بلا ہے؟" یہاں مرزا نے ایک رباعی مقتضائے مقام کے موافق لکھی وہ یہ ہے:- رباعی ؎

اے آں کہ براہِ کعبہ روئے داری ٭ دانم کہ گزیدہ آرزوئے داری
زیں گونہ کہ تندی خرامی، دانم ٭ درخانہ زنے ستیزہ خوئے داری

(۱۸) مرزا اپنی شوخ طبعی کے ہاتھ سے مجبور تھے اور کسی موقع پر خوش طبعی کرنے سے نہ چوکتے تھے مرزا الٰہی بخش خانِ معروف جن کے تقدس اور بزرگی کے سبب اُن کے بڑے بھائی زانوئے ادب تہ کرکے اُن کے سامنے بیٹھتے تھے اور جو مرزا کے خسر ہونے کے سبب اُن کے قبلہ و کعبہ تھے۔ اُن کے آگے بھی مرزا اپنی شوخی سے باز نہ آتے تھے۔ وہ لوگوں کو مرید بھی کیا کرتے تھے اور جب بہت سے مرید ہو جاتے تھے تو اُن کو اپنے سلسلے کے تمام مشائخ کا شجرہ لکھوا کر ایک ایک کاپی سب کو تقسیم کیا کرتے تھے۔ اُنھوں نے مرزا کو شجرہ دیا کہ اُس کی نقل کر دو۔ آپ نے شجرہ کی نقل اس طرح کی کہ ایک نام لکھ دیا اور دوسرا حذف کر دیا، تیسرا پھر لکھ دیا چوتھا پھر ساقط۔ غرض اسی طرح بہت سے حذف و اسقاط

کرکے نقل اور اصل جاکر اُن کے حوالے کی۔ وہ دیکھ کر بہت خفا ہوئے
کہ یہ کیا غضب کیا؟ مرزا نے کہا حضرت! آپ اس کا کچھ خیال نہ
فرمائیے۔ شجرہ دراصل خدا تک پہنچنے کا ایک زینہ ہے، سو زینے
کی ایک ایک سیڑھی اگر بیچ میں سے نکال دی جائے تو چنداں
حرج واقع نہیں ہوتا آدمی ذرا اُچک اُچک کر اوپر چڑھ سکتا ہے
وہ یہ سُن کر بہت چیں بہ جبیں ہوئے اور وہ نقل پھاڑ ڈالی اور کسی
شخص سے اُس کی نقل کرائی اور مرزا ہمیشہ کے لئے اس تکلیف
سے چھوٹ گئے۔

(۱۹) ایک دفعہ شہر میں سخت وبا پڑی میر مہدی حسین
مجروح نے دریافت کیا کہ حضرت وبا شہر سے دفع ہوئی یا ابھی موجود
ہے۔ اُس کے جواب میں مرزا نے لکھا "بھئی! کیسی وبا؟ جب ایک
ستّر برس کے بڈھے اور ستّر برس کی بڑھیا کو نہ مار سکے
تو تُف برین وبا!"

(۲۰) ۱۲۷۷ھ میں مرزا نے اپنے مرنے کی تاریخ یہ کہی کہ "غالب مُرد"
اس سے پہلے کئی مادے غلط ہو چکے تھے۔ منشی جواہر سنگھ جوہر
تخلص جو مرزا کے مخصوصین میں سے تھے، اُن سے مرزا صاحب نے
اس مادّے کا ذکر کیا۔ اُنہوں نے کہا حضرت ان شاء اللہ یہ مادہ

بھی غلط ثابت ہو گا"۔ مرزا صاحب نے کہا "دیکھو صاحب! تم ایسی فال منہ سے نہ نکالو، اگر یہ مادہ مطابق نہ نکلا تو میں سر پھوڑ کر مر جاؤں گا"۔

(۲۱) جب مرزا مرض الموت میں مبتلا تھے نواب علاؤالدین خاں نے لوہارو سے حال پچھوایا اُس کے جواب میں ایک فقرہ اور ایک فارسی شعر جو غالباً شیخ سعدی کا تھا لکھوایا۔ فقرہ یہ تھا "میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پوچھنا" شعر کا پہلا مصرع یاد نہیں دوسرا یہ تھا۔ ع

نہ کردہ ہجر مدارا امن سہر تو سلامت

مرنے سے پہلے اکثر یہ شعر وردِ زبان رہتا تھا ؎

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے * عزیزو! اب اللہ ہی اللہ ہے

(۲۲) غلام علی خاں، وحشت اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، انہیں دونوں صاحبوں کی طرف مرزا صاحب نے اپنی ایک اردو غزل میں اشارہ کیا ہے ؎

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ لکھیں شاید * مر گیا غالبِ آشفتہ نوا کہتے ہیں

---

[۱] یہ صاحب دلّی کے ممتاز لوگوں میں تھے ان کے والد کا نام فرحت اللہ خاں تھا اور مولینا رشیدالدین خاں کے داماد تھے قطعِ نظر علم و فضل کے اردو (بقیہ نوٹ بر صفحہ آئندہ)

یہ دونوں صاحب باہمدگر نہایت گہری دوستی رکھتے تھے یہاں تک
کہ اُن کی دوستی عشق کے درجے تک پہونچ گئی تھی۔ ایک دفعہ
جہانگیر آباد میں سید غلام علی خاں نواب صاحب سے
ملنے کو آئے تھے اور مرزا صاحب نے بھی اُن کا یہاں آنا سُن لیا
تھا۔ انہیں دنوں میں مرزا کا خط نواب صاحب کے نام آیا، اُس میں
خاں صاحب کو بھی سلام لکھا تھا اور اخیر میں خواجہ حافظ کے
مشہور شعر کا پہلا مصرع اس طرح بدل کر لکھا تھا ؎

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) اور فارسی دونوں زبانوں میں نہایت خوش بیان اور شعر کا مذاق
اعلیٰ درجے کا رکھتے تھے۔ اول سرکار انگریزی میں ملازم رہے پھر الور میں فوجدار ہو گئے
پھر لکھنؤ میں نواب سعید الدولہ مرحوم نائب وزیر کے توسط سے کہ اُن سے قرابت
قریبہ رکھتے تھے ایک معزز خدمت پر ممتاز ہو گئے وہاں سے پھر الور چلے آئے تھے
اور غدر تک وہیں رہے غدر کے بعد اخیر عمر تک سررشتہ تعلیم میں منسلک رہے اور
نواب مصطفیٰ خاں ہر حال میں اُن کی مدد کرتے رہے۔ ۱۲

۵۲ نواب صاحب فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے۔ اگرچہ مرزا صاحب
کے تلامذہ میں شمار نہیں ہوتے تھے بلکہ جب تک مومن خاں زندہ رہے اُنہیں سے
مشورۂ سخن کرتے رہے لیکن خاں موصوف کی وفات کے بعد ریختہ اور فارسی دونوں
زبانوں میں وہ برابر مرزا کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ ان کی نسبت غالب فرماتے ہیں ؎

غالب بہ فنِ گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او * ننوشت در دیوان غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نکرد۔ ۱۲
لعنا ...

چو با حبیب نشینی و چائے پیمائی ٭ بیاد آر حریفانِ بادہ پیمارا

ایک عزیز نے یہ لطیفہ سُن کر کہا کہ خواجہ حافظ کے اصل شعر میں اس قدر لطف نہ تھا جیسا کہ اس موقع پر مرزا صاحب کے اس تصرف سے اس میں لطف[1] پیدا ہو گیا۔

(۲۳) ایک صاحب نے جو غالباً بنارس یا لکھنؤ سے دلّی آئے تھے مرزا کے ایک شعر کی اُن کے سامنے نہایت تعریف کی۔ مرزا صاحب نے کہا "ارشاد تو ہو وہ کون سا شعر ہے؟" اُنھوں نے میر امانی متخلص بہ اسد شاگرد مرزا رفیع کا یہ شعر پڑھا:۔

اس جفا پر بتوں سے وفا کی ٭ مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

چوں کہ شعر میں اسد تخلص واقع ہوا تھا اُنھوں نے یہ سمجھا کہ مرزا غالب کا شعر ہے۔ مرزا یہ سُن کر بہت جز بز ہوئے اور فرمایا "اگر یہ کسی اور اسد کا شعر ہے تو اس کو رحمت خدا کی اور اگر مجھ اسد کا شعر ہے تو مجھے لعنت خدا کی۔"

(۲۴) مرزا صاحب کو مرنے سے سات برس پہلے اپنی تاریخ فوت کا ایک مادہ ہاتھ آیا، وہ بہت پسند آیا اور اُسے موزوں فرمایا ؎

[1] یعنی نواب صاحب شراب سے مجتنب تھے اور مرزا پیتے تھے اس لیے اُن کی نسبت چائے پیمائی اور اپنی نسبت بادہ پیما کا لفظ کہا۔ ۱۲

من کہ یا شم کہ جاوداں باشم * چوں نظیری نماند و طالب مرد
وربپرسند درکدامی سال؟ * مُرد غالب بگو کہ غالب مرد
اس حساب سے ۱۲۷۷ھ میں مرنا چاہیئے تھا۔ اسی سال شہر میں سخت وبا آئی، ہزاروں آدمی مرگئے، اُن دنوں دلّی کی بربادی کا غم تازہ تھا چنانچہ میر مہدی صاحب کے جواب میں آپ فرماتے ہیں "وبا کو کیا پوچھتے ہو؟ قدرِ اندازِ قضا کے ترکش میں یہی ایک تیر باقی تھا۔ قتل ایسا عام، لوٹ ایسی سخت، کال ایسا پڑا، وبا کیوں نہ ہو؟ لسان الغیب نے (خود کی طرف اشارہ ہے) دس برس پہلے فرمایا ہے
ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام * ایک مرگِ ناگہانی اور ہے
میاں! ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی مگر میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لایق نہ سمجھا، واقعی اس میں میری کسرِ شان تھی۔ بعدِ رفعِ فساد ہو کے سمجھ لیا جائے گا"

(۳۵) قطعہ۔ نہ پوچھ اس کی حقیقت حضور والا نے * مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں، نکلتے نہ خُلد سے باہر * جو کھاتے حضرتِ آدم یہ بیسنی روٹی
جس وقت چوبدارِ بادشاہی یہ اولوش لے کر آیا ایک باہر کا رہنے والا طالبِ علم جو مرزا صاحب سے کچھ پڑھا کرتا تھا موجود تھا۔ چوبدار کے چلے جانے کے بعد اُس نے مرزا صاحب سے متعجب ہو کر پوچھا کہ

بسنتی روٹی ایسی کیا نادر چیز ہی کہ بادشاہ کے دربار سے بطورِ ادلوش تقسیم ہوتی ہی؟ مرزا نے کہا ارے احمق! چنا وہ چیز ہی کہ اس نے ایک دفعہ جنابِ باری میں فریاد کی تھی کہ دنیا میں مجھ پر بڑے ظلم ہوتے ہیں۔ مجھے دلتے ہیں، پیستے ہیں، بھونتے ہیں، پکاتے ہیں اور مجھ سے سیکڑوں چیزیں بنا کر کھاتے ہیں۔ جیسا مجھ پر ظلم ہوتا ہی ایسا کسی پر نہیں ہوتا۔ وہاں سے حکم ہوا کہ اے چنے تیری خیر اسی میں ہی کہ ہمارے سامنے سے چلا جا، ورنہ ہمارا بھی یہی جی چاہتا ہی کہ تجھ کو کھا جائیں!!

(۳۶) جس زمانے میں مرزا نے برہانِ قاطع پر اعتراض لکھے ہیں اور بہت لوگوں نے مرزا کی سخت مخالفت اور مؤلفِ برہان کی حمایت کی ہی ایک خط میں صاحبِ برہان کا ذکر کرنے کے بعد اُس کی اور اُس کے طرف داروں کی نسبت لکھتے ہیں "ان فرہنگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہی، جو اپنے نزدیک صحیح سمجھا وہ لکھ دیا نظامی و سعدی کی لکھی ہوئی کوئی فرہنگ ہو تو ہم اُس کو مانیں۔ ہندیوں کو کیوں کر مسلّم الثبوت جانیں۔ ایک گائے کا بچہ (یہ اشارہ صاحبِ برہانِ قاطع کی طرف ہی) بزورِ سحر آدمی کی طرح کلام کرنے لگا، بنی اسرائیل اُس کو خدا سمجھے!!

(۲۷) مرزا نے ایک دوست کو رمضان میں خط لکھا اُس میں لکھتے ہیں "دھوپ بہت تیز ہے۔ روزہ رکھتا ہوں مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں۔ کبھی پانی پی لیا، کبھی حقّہ پی لیا، کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا بھی کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجب فہم رکھتے ہیں۔ میں تو روزہ بہلاتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ بہلانا اور بات ہے۔

(۲۸) ایک خط کے آخر میں نواب علاؤالدین خاں کو لکھا ہے اُستاد میرجان کو اس راہ سے کہ میری پھپھی اُن کی چچی تھیں اور یہ مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں، دعا۔ اور اس رو سے کہ دوست ہیں اور دوستی میں کمی و بیشی سن و سال کی رعایت نہیں کرتے سلام۔ اور اس سبب سے کہ اُستاد کہلاتے ہیں، بندگی۔ اور اس نظر سے کہ سیّد ہیں، درود۔ اور موافق مضمون اس مصرع کے

ع ؎ سوی اللہ واللہ مافی الوجود سجود۔

(۲۹) نواب امیر الدین احمد خاں رئیس لوہارو کے بچپن کے زمانے میں اُن کے رقعے کا جواب جس میں اُنہوں نے مرزا صاحب کو تعظیماً دادا صاحب لکھا تھا یوں لکھتے ہیں "اے مردم چشم جہاں بین غالب پہلے القاب کے معنے سمجھ لو یعنی چشم جہاں بیں غالب

کی پُتلی چشمِ جہاں ہیں، تمہارا باپ مرزا علاؤ الدین خاں بہادر اور پتلی تم۔ میاں تمہارے دادا تو نواب امین الدین خاں بہادر رہیں ہیں تو صرف تمہارا دل دادہ ہوں۔

(۳۰) ایک دوست کو دسمبر ۱۸۵۸ء کی اخیر تاریخوں میں خط لکھا ہی انہوں نے اُس کے جواب میں پہلی یا دوسری جنوری ۱۸۵۹ء کو لکھ بھیجا، اُس کے جواب میں اُن کو اس طرح لکھتے ہیں "دیکھو صاحب! یہ باتیں ہم کو پسند نہیں، ۱۸۵۸ء کے خط کا جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہو اور مزا یہ کہ تم سے کہا جائے گا تو یہ کہو گے کہ میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا ہے۔

(۳۱) ایک خط میں برسات کی شدّت کا ذکر کرتے کرتے مرزا، نواب علاؤ الدین خاں کو لکھتے ہیں "میاں! بڑی مصیبت میں ہوں محل سرا کی دیواریں گر گئی ہیں۔ پاخانہ ڈھہ گیا، چھتیں ٹپک رہی ہیں، تمہاری پھوپی کہتی ہیں کہ ہائے دبی ہائے مری۔ دیوان خانہ کا حال محل سرا سے بدتر ہی، میں مرنے سے نہیں ڈرتا، فقدانِ راحت سے گھبراتا ہوں، چھت چھلنی ہی۔ ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہی، مالک اگر چاہے کہ مرمت کرے تو کیوں کر کرے، مینھ کھلے تو سب کچھ ہو اگر تم سے ہو سکے تو برسات تک بھائی سے مجھ کو وہ حویلی جس میں میر حسن رہتے تھے اپنی پھوپی کے رہنے کو اور کوٹھی

ہیں سے وہ بالاخانہ مع دالانِ زیریں جو الٰہی بخش خاں[1] مرحوم کا مسکن تھا، میرے رہنے کو دلوا دو۔ برسات گزر جائے گی، مرمّت ہو جائے گی۔ پھر صاحب اور میم اور بابا[2] لوگ اپنے قدیم مسکن میں آرہیں گے۔ تمہارے والد کے ایثار و عطا جہاں مجھ پر احسان ہیں ایک یہ مروّت کا احسان میرے پایانِ عمر میں اور بھی سہی۔"

(۳۲) ارشاد حسین خاں صاحب خیرآبادی جو مولوی فضلِ حق کے عزیزوں میں سے تھے غالبؔ سے ملنے گئے جو اُن کے بزرگوں کے ملنے والے تھے۔ غالب کو اواخرِ عمر میں ثقلِ سماعت ہو گیا تھا، پوچھا یہ کون صاحب ہیں؟ ان کے ساتھ ایک اور صاحب تھے اُنہوں نے کہا ارشاد حسین ہیں۔ غالب نے کہا "ہمارا ارشاد حسین؟" غالب حقّہ پی رہے تھے اُن کی طرف بڑھا دیا۔ انہوں نے بپاسِ ادب کہا کہ میں اس سے محروم ہوں۔ غالب نے کہا "ارے میاں بیتے بھی نہیں تو اور کچھ منگاتا ہوں۔"

(۳۳) نوّاب علاؤالدین خاں اور اُن کے والد نوّاب امین الدین خاں

[1] نواب الٰہی بخش خاں مرحوم کی بیٹی نواب حسام بخش خاں مرحوم کی حقیقی بھتیجی ہوئیں، وہ مرزا کی بی بی تھیں۔ ۱۲۔ [2] چوں کہ کوٹھی کا مکان رہنے کو مانگا ہے اس لیے اپنے تئیں صاحب اور بی بی کو میم صاحب اور بچوں کو بابا لوگ بتایا ہے۔ ۱۲

ہیں کچھ شکر رنجی تھی۔ باپ دلّی آئے بیٹے کو لوہارو چھوڑ آئے مرزا نواب علاؤ الدین خاں کو خط میں لکھتے ہیں "سُنا گیا کہ نواب امین الدین خاں صاحب نے اپنی کوٹھی میں نزولِ اجلال کیا۔ پھر دن رہے از راہِ مہربانی ناگاہ میرے ہاں تشریف لائے۔ میں نے نہیں پوچھا کہ وہ کیوں نہیں آئے؟ بھائی صاحب بولے کہ جب میں یہاں آیا تو کوئی وہاں بھی تو رہے، اس سے علاوہ وہ اپنے بیٹے کو بہت چاہتے ہیں میں نے کہا اتنا ہی، جتنا تم اُس کو چاہتے ہو؟ ہنسنے لگے غرض کہ میں نے بظاہر اُن کو تم سے اچھا پایا۔ آگے تم لوگوں (یعنی احمد بخش خانیوں کے) دل کا اللہ مالک ہے۔"

(۴۳) ایک دفعہ مرزا صاحب نے تنگ آکر بعض ضروری اخراجات بند کر دیئے یہاں تک کہ شراب پینا بھی چھوڑ دیا۔ نواب علاؤ الدین خاں نے اپنے والد کے اشارے سے اس کا سبب دریافت کیا اور مولوی حمزہ خاں کی طرف سے بطورِ نصیحت یہ شعر لکھا۔

چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو الخ

اُس کا جواب اس طرح لکھتے ہیں۔ بھائی کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں ہے کہ اِدھر متھرا داس سے قرض لیا اُدھر دربارئی مل کو جا مارا۔ اِدھر خوب چند چین سُکھ کی کوٹھی جا لوٹی۔ ہر ایک کے

پاس تمسّکِ مُہری موجود ہے۔ شہد لگاؤ اور چاٹو۔ نہ مول نہ سود۔ اس سے بڑھ کر یہ بات کہ روٹی کا خرچ بالکل پھپھی کے سر اور باسٹھ رُپیئے آٹھ آنے کلکٹری کے، سو روپیئے رام پور کے، قرض دینے والا ایک میر امختارِ کار، وہ ماہ بماہ سود لیا چاہے، مول میں قسط اس کو دینی پڑے انکم ٹیکس جُدا۔ چوکیدارہ جُدا، سود جُدا، مول جُدا، بی بی جُدا، شاگرد پیشہ جُدا، آمد وہی ایک سو باسٹھ۔ تنگ آ گیا، گزارا مشکل ہو گیا روزمرّہ کا کام بند رہنے لگا۔ سوچا کہ کیا کروں؟ کہاں سے گنجایش نکالوں؟ قہرِ درویش بجانِ درویش۔ صبح کی تبرید متروک ہے، چاشت کا گوشت اُدھار۔ رات کی شراب وگلاب موقوف۔ بیس بائیس روپیئے مہینا بچا، روزمرّہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا تبرید و شراب کب تک نہ پیوگے؟ کہا گیا کہ جب تک وہ نہ پلائیں گے۔ پوچھا کہ نہ پیوگے تو کس طرح جیوگے؟ جواب دیا کہ جس طرح وہ جلائیں گے۔ بارہ مہینے پورے نہ گزرے تھے کہ رام پور سے علاوہ وجہِ مقرری کے اور روپیہ آ گیا۔ قرضِ مُقسط ادا ہو گیا متفرق رہا، خیر رہو۔ صبح کی تبرید۔ رات کی شراب جاری ہو گئی۔ گوشت پورا آنے لگا۔ چوں کہ بھائی نے وجہِ موقوفی اور بحالی پوچھی تھی اُن کو یہ عبارت پڑھا دینا اور حمزہ خاں کو بعد سلام کہنا۔ اے بے خبر لذّت

شُربِ مدامِ ما۔ دیکھا ہم کو یوں پلاتے ہیں۔ دریبے کے بنیوں کے لونڈوں کو پڑھاکر مولوی مشہور ہونا اور رسائلِ ابوحنیفہ کو دیکھنا اور مسائلِ حیض و نفاس میں غوطہ مارنا اور ہی اور عرفا کے کلام سے حقیقتِ حقّہ وحدتِ وجود کو اپنے دل نشین کرنا اور ہی مشرک وہ ہی جو وجود کو واجب و ممکن میں مشترک جانتے ہیں مشرک وہ ہیں جو مُسَیلمہ کو نبوّت میں خاتم المرسلین کا شریک گردانتے ہیں مشرک وہ ہیں جو نو مسلموں کو ابوالائمہ کا ہمسر مانتے ہیں۔ دوزخ ان لوگوں کے واسطے ہی ہیں موحّدِ خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لا الہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لاموجود الا اللہ لامؤثر فی الوجود اللہ سمجھا ہوا ہوں۔ انبیا سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت سب مفترض الطاعت تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوّت ختم ہوئی یہ ختم المرسلین اور رحمۃ للعالمین ہیں مقطعِ نبوت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہی اور امام من اللہ علیؑ[۱] علیہ السلام ہی ثمّ حسن ثمّ حسین اس طرح تا مہدیِ موعود علیہ السلام بریں جی زیم ہم بریں بگزرم" ہاں اتنی بات اور ہی کہ اباحت و زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں

۱؎ مرزا کے تمام خاندان کا اور بزرگوں کا مذہب سنّت و جماعت تھا مگر (بقیہ نوٹ بر صفحۂ آئندہ)

اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا بلکہ میں دوزخ کا ایندھن بنوں گا اور دوزخ کی آنچ کو تیز کروں گا۔ تاکہ مشرکین نبوت مصطفوی و امامت مرتضوی اُس میں جلیں۔ سنو! مولوی صاحب! تم نے کی تاقوں میں ایک شعر حافظؔ کا حفظ کیا جوں پیر رشدی حافظ از میکدہ بیروں شو الخ اور پھر پڑھتے ہو اُس کے سامنے کہ اس کی نظم کا دفتر حافظ کے دیوان سے دوچند سہ چند ہی مجموعہ نظم جداگانہ اور یہ بھی لحاظ نہیں کرتے کہ ایک شعر حافظؔ کا یہ ہو اور ہزار شعر اس کے مخالف ہیں۔

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) اہلِ دربار اور تصنیفات سے بھی ثابت ہے کہ اُن کا مذہب شیعہ تھا۔ (جیسا کہ اس خط سے بھی ہویدا ہے) اور لطف یہ کہ ظہور اس کا جوشِ محبت اہلِ بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین میں تھا چنانچہ اکثر لوگ انہیں نصیری کہتے تھے اور وہ سُن کر خوش ہوتے تھے، چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں:- منصور فرقہ علی اللہیاں منم + آوازہ انا اسد اللہ افگنم۔ تمام اقربا اور حقیقی دوست سُنت جماعت تھے لیکن اُن کی اپنایت میں کسی طرح کی دوئی نہ معلوم ہوتی تھی۔ مولینا فخرالدین کے خاندان کے مُرید بھی تھے۔ دربار و اہلِ دربار میں کبھی اس معاملے کو نہیں کھولتے تھے (از آبِ حیات) ۱۲۔

(۲۵) ایک خط میں مرزا تعلقاتِ خانہ داری کی اس طرح شکایت کرتے ہیں:۔ سنو! عالم دو ہیں، ایک عالمِ ارواح، ایک عالمِ آب و گل حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے جو خود فرماتا ہے لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ[52] اور جو آپ ہی جواب دیتا ہے لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَہَّارِ، ہرچند قاعدہ عام یہ ہے کہ عالمِ آب و گل کے مجرم عالمِ ارواح میں سزا پاتے ہیں لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالمِ ارواح کے گناہ گار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں چنانچہ میں ۸ رجب ۱۲۱۲ھ کو روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا (یعنی پیدا ہوا) تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکمِ حبس دوام (یعنی نکاح) صادر ہوا۔ ایک بیڑی[53] میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلّی شہر کو زندان مقرر کیا اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا۔ فکرِ نظم و نثر کو مشقت ٹھیرایا۔ برسوں کے بعد میں جیل خانے سے بھاگا، تین برس بلادِ شرقیہ میں پھرتا رہا، پایانِ کار مجھے کلکتے سے پکڑ لائے اور پھر اسی مجلس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا

---

[52] (خدا کی طرف سے ندا ہوگی کہ) آج کس کی حکومت ہے؟ (تو سب مارے حیرت کے خاموش رہیں گے اور خود بارگاہِ خداوندی سے ندا ہوگی کہ حکومت) اکیلے اللہ ہی کی ہے جو بڑا زبردست ہے۔ ۱۲

[53] یعنی بیوی۔ ۱۲

کہ یہ قیدی گریز پا ہے دو ہتکڑیاں[1] اور بڑھا دیں۔ پاؤں بیڑی سے نگار، ہاتھ ہتکڑیوں سے زخم دار، مشقّتِ مقرری مشکل ہو گئی۔ طاقت یک قلم زائل ہو گئی ہاے بے حیا ہوں، سالِ گزشتہ بیڑی کو زاویۂ زنداں میں چھوڑ مع دو ہتکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ مراد آباد ہوتا ہوا رام پور، کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑ آگیا اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں کیا بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔ حکمِ رہائی دیکھیے کب صادر ہو؟ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اس ماہِ ذی الحجہ میں چھوٹ جاؤں۔ بہر تقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا میں بعد نجات سیدھا عالمِ ارواح کو چلا جاؤں گا۔ ؎

فرّخ آں روز کہ از خانۂ زنداں بروم
سوئے شہرِ خود ازیں وادیِ ویراں بروم

(۳۶) مرزا ایک خط میں نواب علاؤ الدین خاں کو لکھتے ہیں کُل تمھارے خط میں دو بار یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلی بڑا شہر ہے، ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے۔ اے میری جان! یہ وہ دلّی نہیں

[1] دو ہتکڑیوں سے مراد حسین علی خاں اور باقر علی خاں جن کو مرزا نے اُن کے والد زین العابدین خاں کی وفات کے بعد خود فرزندوں کی طرح پرورش کیا تھا۔ ۱۲

ہے جس میں تم پیدا ہوئے ہو۔ وہ دلّی نہیں ہے جس میں تم نے تحصیلِ علم کیا ہے۔ وہ دلّی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے۔ وہ دلّی نہیں ہے جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں، وہ دلّی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں۔ ایک کیمپ ہے جس میں مسلمان، اہلِ حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ، باقی سراسر ہنود۔ بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپئے مہینا پاتے ہیں۔ امرائے اہلِ اسلام میں اموات گنو تو حسن علی خاں بہت بڑے باپ کا بیٹا، سو روپئے روز کا پنشن دار، سو روپئے مہینے کا روزینہ دار بن کر نامراد انہ مر گیا۔

میر ناصر الدین کے باپ کی طرف سے پیرزادہ، نانا اور نانی کی طرف سے امیرزادہ، مظلوم مارا گیا۔ تمہارے چچا کی سرکار سے تجہیز و تکفین ہوئی۔ احبا کو پوچھو تو ناظر حسین مرزا جس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آیا، اُس کے پاس ایک پیسہ نہیں، ٹکے کی آمد نہیں، مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے مگر دیکھئے چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے بڈھے صاحب ساری املاک بیچ کر اور نوش جان کر کے بیک بینی و دو گوش بھرت پور چلے گئے۔ ضیاء الدولہ کی پانسو روپئے کرایہ کی املاک واگزاشت ہو کر پھر قرق ہو گئی، تباہ خراب

لاہور گیا، وہاں پڑا ہوا ہے، دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ قصّہ کوتاہ قلعہ اور جھجّر اور بہادر گڑھ اور بلّب گڈھا اور فرخ نگر کم وبیش تیس لاکھ کی ریاستیں مٹ گئیں، شہر کی عمارتیں خاک میں مل گئیں، ہنر مند آدمی یہاں کیوں پایا جائے۔ جو حکما کا حال کل لکھا ہے وہ بیان واقعی ہے۔ صلحا اور زہاد کے باب میں جو حرف میں نے مختصر لکھا ہے اُس کو بھی سچ جانو"

(۳۷) مرزا ایک خط میں لکھتے ہیں "ناتوانی زور پر ہے۔ بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے، ضعف سستی، کاہلی، گراں جانی، رکاب میں پاؤں ہے باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر دور و دراز درپیش ہے زادِ راہ موجود نہیں خالی ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر ناپرسیدہ بخش دیا تو خیر، اور اگر باز پرس ہوئی تو سقر مقر ہے اور ہاویہ زاویہ ہے۔ دوزخ جاوید ہے اور ہم ہیں۔ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے ✻ مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

(۳۸) مرزا ایک اور خط میں منشی ہرگوپال کو لکھتے ہیں "تم مشقِ سخن کر رہے ہو اور میں مشقِ فنا میں مستغرق ہوں۔ بوعلی سینا کے علم اور نظیری کے شعر کو ضائع اور بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں زیست بسر کرنے کو کچھ تھوڑی سی راحت درکار ہے اور باقی حکمت اور

سلطنت اور شاعری اور ساحری سب خرافات ہے۔ ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا تو کیا اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا۔ دنیا میں نام آور ہوئے تو کیا، گم نام جیئے تو کیا۔ کچھ معاش ہو اور کچھ صحت جسمانی، باقی سب وہم ہے۔ اے یارِ جانی ہر چند وہ بھی وہم ہے مگر میں ابھی اسی پایہ پر ہوں۔ شاید آگے بڑھ کر یہ پردہ بھی اٹھ جائے اور وجہ معیشت اور صحت اور راحت سے بھی گزر جاؤں۔ عالم بے رنگی میں گزر پاؤں۔ جس سناٹے میں میں ہوں وہاں تمام عالم بلکہ دونوں عالم کا پتا نہیں۔ ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دیئے جاتا ہوں یہ دریا نہیں ہے سراب ہے ہستی نہیں ہے پندار ہے۔ ہم تم دونوں اچھے خاصے شاعر ہیں مانا کہ سعدی و حافظ کے برابر مشہور نہ ہوئے، اُن کو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہم کو تم کو ہوگا۔"

(۳۹) مرزا یوسف مرزا کو اُن کے باپ کی تعزیت میں لکھتے ہیں "یوسف مرزا کیوں کر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا اور اگر لکھوں تو آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو مگر صبر۔ یہ ایک شیوۂ فرسودہ ابنائے روزگار ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں۔ صبر کرو۔ ہائے! ایک کا کلیجہ کٹ گیا ہے اور لوگ اُسے کہتے ہیں تو نہ تڑپ، بھلا کیوں کر نہ تڑپے گا۔ صلاح اس امر میں نہیں بتائی

جاتی۔ دعا کو دخل نہیں دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا پھر باپ مرا
مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سر و پا کس کو کہتے ہیں تو میں کہوں گا
یوسف مرزا کو۔ تمہاری دادی لکھتی ہیں کہ رہائی کا حکم ہو چکا تھا
اگر یہ بات سچ ہی تو جواں مرد ایک بار دونوں قیدوں سے چھوٹ
گیا نہ قیدِ حیات رہی، نہ قیدِ فرنگ۔

(۴۰) انہیں کو بیٹے کی تعزیت میں لکھتے ہیں " ای مری جان!
ای مری آنکھوں! ؎

نہ ہجرانِ طفلے کہ در خاک رفت ✽ چہ نالی کہ پاک آمد و پاک رفت

وہ خدا کا مقبول بندہ تھا وہ اچھی روح اور اچھی قسمت لے کر آیا تھا
یہاں رہ کر کیا کرتا؟ ہرگز غم نہ کرو، اور ایسی ہی اولاد کی خوشی ہی تو
ابھی تم خود بچے ہو، خدا تم کو جیتا رکھے، اولاد بہت۔ نا تا ناقی کے
مرنے کا ذکر کیوں کرتے ہو وہ اپنی اجل سے مرے۔ بزرگوں کا مرنا
بنی آدم کی میراث ہی۔ کیا تم چاہتے ہو کہ وہ اس عہد میں ہوتے اور
اپنی آبرو کھوتے۔ ہاں **مظفر الدولہ** کا غم من جملہ واقعاتِ
کربلا سے متعلق ہی یہ داغ جیتے جی نہ مٹے گا۔

(۴۱) **مرزا** لکھتے ہیں " قلم اگرچہ دیکھنے میں دو زبان ہی لیکن وحدتِ
حقیقی کا راز داں ہی، گفتگوئے توحید میں وہ لذت ہی کہ جی چاہتا ہی

کوئی سو بار کہے اور سو بار سُنے۔ نبی کی حقیقت ذوجہتین ہے۔
ایک جہت خالق کی کہ جس سے اخذِ فیض کرتا ہے اور ایک جہت خلق
کی کہ جس سے فیض پونہچاتا ہے ؎

نبی را دو وجہ است از بہرِ خلق ٭ یکے سوئے خالق یکے سوئے خلق
بداں وجہ از حق بود مُستفیض ٭ بدیں وجہ بر خلق باشد مفیض

(۴۲) مرزا سے اکثر لوگ پنشن کا حال دریافت کرتے ایک مرتبہ
میر مہدی مجروح نے اس مضمون کا خط بھیجا تھا اُس کے جواب
میں مرزا صاحب لکھتے ہیں:۔ مُیاں بے رزق جینے کا ڈھب مجھ
کو آگیا ہے، اس طرف سے خاطر جمع رکھنا۔ رمضان کا مہینا روزے
کھا کھا کر کاٹا، آگے خدا رزّاق ہے، کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے۔
(۴۳) کسی نے امراؤ سنگھ نام ایک شاگرد کی بیوی کے مرنے کا
حال مرزا کو لکھا اور اُس میں یہ بھی لکھا کہ اُس کے ننّھے ننّھے
بچّے ہیں، اگر اب تیسری شادی نہ کرے تو کیا کرے اور بچّوں کی
کس طرح پرورش ہو؟ مرزا اُس کے جواب میں لکھتے ہیں۔
"امراؤ سنگھ کے حال پر اُس کے واسطے رحم اور اپنے واسطے رشک
آتا ہے۔ اللہ اللہ! ایک وہ ہیں کہ دو دو بار اُن کی بیڑیاں کٹ
چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا

گلے میں پڑا ہی تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہی، نہ دم ہی نکلتا ہی۔ اُس کو سمجھاؤ کہ بھائی تیرے بچّوں کو میں پال لوں گا، تو کیوں بلا میں پھنستا ہی؟"

(۴۴) مرزا حاتم علی بیگ مہر نے اپنی تصویر مرزا کو بھیجی اُس کی رسید اِس طرح لکھتے ہیں:۔ حلیہ مبارک نظر افروز ہوا، تمہارا حلیہ دیکھ کر تمہارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہی۔ تمہارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اُس کی ستائش کرتے تھے اب جو کبھی مجھ کو اپنا وہ رنگ یاد آتا ہی تو چھاتی پر سانپ پھر جاتا ہی۔ ہاں مجھ کو رشک آیا اور میں نے خونِ جگر کھایا تو اس بات پر کہ ڈاڑھی گھٹی ہوئی ہی وہ مزے یاد آگئے، کیا کہوں جی پر کیا گزری، بقولِ شیخ علی حزیں ؎

تا دستر سم بود زدم چاکِ گریباں[1] ٭ شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

جب ڈاڑھی موچھ میں بال سفید آگئے، تیرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت

[1] یہاں اس شعر کے لکھنے سے یہ مراد رکھتی ہی کہ جب تک مجھے موقعہ ملا برابر ڈاڑھی کا حق ادا کرتا رہا یعنی مُنڈاتا رہا، پس اُس سے میں کسی طرح شرمندہ نہیں ہوں۔ ۱۲

ٹوٹ گئے، ناچار مستی بھی چھوڑ دی اور ڈاڑھی بھی مگر یاد رکھیئے کہ اس بھونڈے شہر (یعنی دلّی) میں ایک وردی ہے عام، ملّا، حافظ بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقّہ، بھٹیارہ، مُنہ پر ڈاڑھی سر پہ بال فقیر نے جس دن ڈاڑھی رکھی اُسی دن سر منڈایا۔

(۴۵) مرزا کی آن بان[۱]

۱۸۴۲ء میں گورنمنٹ انگلشیہ کو **دہلی کالج** کا انتظام از سرِ نو منظور ہوا۔ **ٹامسن صاحب** جو کئی سال تک اضلاعِ شمال و مغرب کے لفٹنٹ گورنر بھی رہے۔ اُس وقت سکریٹری تھے۔ وہ مدرسین کے امتحان کے لئے دلّی آئے، اور چاہا کہ جس طرح سو روپئے مہینے کا ایک مدرس عربی ہے۔ ایسا ہی ایک فارسی کا بھی ہو، لوگوں نے چند کاملوں کے نام بتائے۔ اُن میں مرزا کا نام بھی آیا۔ مرزا صاحب حسب الطلب تشریف لائے۔ صاحب کو اطلاع ہوئی۔ مگر یہ پالکی سے اُتر کر اس انتظار میں ٹھیرے کہ حسبِ دستورِ قدیم صاحب سکریٹری استقبال کو تشریف لائیں گے۔ جب کہ نہ وہ اُدھر سے آئے۔ نہ یہ اِدھر سے گئے۔ اور دیر ہوئی تو صاحب سکریٹری نے جمعدار سے پوچھا وہ پھر باہر آیا کہ آپ کیوں نہیں چلتے اُنہوں نے کہا کہ صاحب استقبال کو تشریف نہیں لائے۔ میں کیونکر جاتا جمعدار

[۱] مولینا آزاد نے آن تان لکھا ہے حالانکہ دہلی میں آن بان بولتے ہیں مطلب خودداری اور وضعداری ہے۔ ۱۲

نے جاکر پھر عرض کی۔ صاحب باہر آ گئے۔ اور کہا کہ جب آپ دربار گورنری میں بحیثیتِ ریاست تشریف لائیں گے۔ تو آپ کی وہ تعظیم ہوگی۔ لیکن اس وقت آپ نوکری کے لیئے آئے ہیں۔ اُس تعظیم کے مستحق نہیں۔ مرزا صاحب نے فرمایا کہ گورنمنٹ کی ملازمت باعثِ زیادتیِ اعزاز سمجھتا ہوں۔ نہ یہ کہ بزرگوں کے اعزاز کو بھی گنوا بیٹھوں۔ صاحب نے فرمایا کہ ہم آئین سے مجبور ہیں۔ مرزا صاحب رخصت ہو کر چلے آئے۔

(۴۶) میر مہدی تم میری عادات کو بھول گئے۔ ماہِ مبارک رمضان میں کبھی مسجد جامع کی تراویح ناغہ ہوئی ہے؟ میں اس مہینے میں رام پور کیوں کر رہتا۔ نواب صاحب مانع رہے اور بہت منع کرتے رہے۔ برسات کے آموں کا لالچ دیتے رہے۔ مگر بھائی میں ایسے انداز سے چلا کہ چاند رات کے دن یہاں آ پہنچا۔ یکشنبہ کو غُرّۂ ماہِ مقدس ہوا۔ اُسی دن سے ہر صبح کو حامد علی خان کی مسجد میں جا کر جناب مولوی جعفر علی صاحب سے قرآن سُنتا ہوں شب کو مسجد جامع جا کر نمازِ تراویح پڑھتا ہوں۔ کبھی جو جی میں آتی ہے تو وقتِ صوم مہتاب باغ میں جا کر روزہ کھولتا ہوں اور سرد پانی پیتا ہوں۔ واہ واہ کیا اچھی طرح عمر بسر ہوتی ہے۔ اب اصل

حقیقت سنو۔ لڑکوں کو ساتھ لے گیا تھا وہاں اُنھوں نے میرا ناک میں دم کر دیا۔ تنہا بھیج دینے میں وہم آیا کہ خدا جانے اگر کوئی امر حادث ہو تو بدنامی عمر بھر رہے۔ اس سبب سے جلد چلا آیا۔ ورنہ گرمی برسات وہیں کاٹتا۔ اب بشرطِ حیات جدیدہ بعد برسات جاؤں گا اور بہت دنوں تک یہاں نہ آؤں گا۔ قرار داد یہ ہے کہ نواب صاحب جولائی ۱۸۵۹ء سے کہ جس کو یہ دسواں مہینا ہے۔ سو روپے مجھے ماہ بماہ بھیجتے ہیں۔ اب میں جو وہاں گیا۔ تو سو روپے مہینا بنام دعوت اور دیا۔ یعنی رامپور رہوں تو دو سو روپے مہینا پاؤں۔ اور دلّی رہوں تو سو روپے۔ بھائی! سو دو سو میں کلام نہیں۔ کلام اس میں ہے کہ نواب صاحب دوستانہ و شاگردانہ دیتے ہیں۔ مجھ کو نوکر نہیں سمجھتے ہیں۔ ملاقات بھی دوستانہ رہی بمعانقہ و تعظیم جس طرح احباب میں رسم ہے وہ صورت ملاقات کی ہے۔ لڑکوں سے میں نے نذر دلوائی تھی بس بہر حال غنیمت ہے۔ رزق کے اچھّی طرح ملنے کا شکر چاہیئے۔ کمی کا شکوہ کیا ہے انگریزی سرکار سے دس ہزار روپیئے سال ٹھیرے۔ اُس میں سے مجھ کو ملے ساڑھے سات سو روپیئے سال۔ ایک صاحب نے نہ دیئے مگر تین ہزار روپیئے سال عزّت میں وہ پایا جو رئیس زادوں کے واسطے ہوتا ہے نیا نیا

خان صاحب بسیار مہربان دوستان القاب خلعتِ سات پارچہ اور جیغہ وسرپیچ و مالائے مروارید۔ بادشاہ اپنے فرزندوں کے برابر پیار کرتے تھے بخشی۔ ناظر۔ حکیم۔ کسی سے توقیر کم نہیں۔ مگر فائدہ وہی قلیل۔ سو میری جان! یہاں بھی وہی نقشہ ہے کوٹھری میں بیٹھا ہوں۔ ٹٹی لگی ہوئی ہے۔ ہوا آرہی ہے۔ پانی کا جھجر دھرا ہوا ہے۔ حقہ پیا رہا ہوں۔ یہ خط لکھ رہا ہوں۔ تم سے باتیں کرنے کو جی چاہا یہ باتیں کرلیں۔"

(۴۷) زبان کی نسبت مرزا کا ایک لطیفہ مشہور ہے دلّی میں رتھ کو بعضے مؤنث اور بعضے محض مذکر بولتے ہیں۔ کسی نے مرزا صاحب سے پوچھا کہ حضرت! رتھ مؤنث ہے یا مذکر؟ آپ نے کہا "بھیّا! جب رتھ میں عورتیں بیٹھی ہوں تو مؤنث کہو اور جب مرد بیٹھیں تو مذکر سمجھو۔"

(۴۸) دلّی میں مشاعرہ تھا۔ مرزا نے اپنی فارسی غزل پڑھی مفتی صدر الدین خاں صاحب اور مولوی امام بخش صاحب صہبائی جلسے میں موجود تھے۔ مرزا صاحب نے جس وقت یہ مصرع پڑھا ع "بوادیٔ کہ دراں خضر را عصا خفت است" مولوی صہبائی کی تحریک سے مفتی صاحب نے فرمایا کہ عصا خفت است میں کلام ہے مرزا نے

کہاکہ حضرت! میں ہندی نژاد ہوں۔ میرا عصا پکڑ لیا۔ اُس شیرازی کا عصا نہ پکڑا گیا ع دے بجملہ اوّل عصائے شیخ بجفت + انہوں نے کہاکہ اصل محاورہ میں کلام نہیں کلام اس میں ہو کہ مناسبِ مقام ہو یا نہیں۔

(۴۹) ایک دفعہ مرزا بہت قرض دار ہو گئے۔ قرض خواہوں نے نالش کر دی۔ جوابدہی میں طلب ہوئے۔ مفتی صاحب کی عدالت تھی۔ جس وقت پیشی میں گئے یہ شعر پڑھا:۔ ؎

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں * رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

(۵۰) مرزا صاحب کو ایک آفتِ ناگہانی کے سبب سے چند روز جیل خانہ میں اس طرح رہنا پڑا کہ جیسے حضرت یوسف کو زندانِ مصر میں۔ کپڑے میلے ہو گئے۔ جوئیں پڑ گئی تھیں۔ ایک دن بیٹھے اُن میں سے جوئیں چن رہے تھے۔ ایک رئیس وہیں عیادت کو پہنچے۔ پوچھا کیا حال ہے؟ آپ نے یہ شعر پڑھا ؎

ہم غمزدہ جس دن سے گرفتارِ بلا ہیں * کپڑوں میں جوئیں بخیوں کے ٹانکوں سے سوا ہیں

جس دن وہاں سے نکلنے لگے۔ اور لباس تبدیل کرنے کا موقع آیا تو وہاں کا کُرتہ وہیں پھاڑ کر پھینکا اور یہ شعر پڑھا۔ ؎

ہائے اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ * جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

(۵۱) حسین علی خاں چھوٹا لڑکا ایک دن کھیلتا کھیلتا آیا کہ داداجان

مٹھائی منگا دو۔ آپ نے فرمایا کہ پیسے نہیں۔ وہ صندوقچہ کھول کر اِدھر اُدھر پیسے ٹٹولنے لگا۔ آپ نے فرمایا ؎

درم و دام اپنے پاس کہاں ٭ چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

(۵۲) پنشن سرکار سے ماہ بماہ ملتی تھی۔ بغاوتِ دہلی کے بعد حکم ہوا کہ ششماہی ملا کرے اس موقع پر ایک دوست کو لکھتے ہیں ؎

رسم ہے مُردہ کی چھ ماہی ایک ٭ خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو کہ ہوں بقیدِ حیات ٭ اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار

مگر یہ دو شعر حقیقت میں ایک قصیدے کے ہیں جس کی بدولت بادشاہِ دہلی کے دربار سے ششماہی تنخواہ کے بیئے ماہواری حکم حاصل کیا تھا۔ فارسی کے قصائد میں بھی اس قسم کے غزل و نصب اُنہوں نے اکثر کیئے ہیں۔ اور یہ کچھ عجیب بات نہیں۔ انوری وغیرہ اکثر شعرا نے ایسا کیا ہے۔

(۵۳) مولوی فضلِ حق صاحب مرزا کے بڑے دوست تھے۔ ایک دن مرزا اُن کی ملاقات کو گئے۔ اُن کی عادت تھی کہ جب کوئی بے تکلف دوست آیا کرتا تو خالقِ باری کا یہ مصرع پڑھا کرتے تھے ؏ بیا برادر آو رے بھائی ٭ چنانچہ مرزا صاحب کی تعظیم کو اُٹھ کھڑے ہوئے اور یہی مصرع کہہ کر بٹھا دیا ابھی بیٹھے ہی تھے کہ

مولوی صاحب کی رنڈی بھی دوسرے دالان سے اُٹھ کر پاس آن بیٹھی مرزا نے فرمایا ہاں صاحب اب وہ دوسرا مصرع بھی فرما دیجیے ع

نشیں ما در بیٹھ رہی مائی

(۵۴) بہن بیمار تھیں۔ آپ عیادت کو گئے۔ پوچھا کیا حال ہے۔ وہ بولیں کہ مرتی ہوں قرض کی فکر ہے کہ گردن پر لیے جاتی ہوں۔ آپ نے کہا کہ بوا! بھلا یہ کیا فکر ہے! خدا کے ہاں کیا مفتی صدرالدین خاں بیٹھے ہیں جو ڈگری کر کے پکڑوا بلائیں گے۔

(۵۵) ایک دن مرزا کے شاگرد رشید نے آکر کہا حضرت آج میں امیر خسرو کی قبر پر گیا۔ مزار پر کھرنی کا درخت ہے۔ اُس کی کھرنیاں میں نے خوب کھائیں۔ کھرنیوں کا کھانا تھا کہ گویا فصاحت و بلاغت کا دروازہ کھل گیا۔ دیکھیے تو میں کیسا فصیح ہو گیا۔ مرزا نے کہا کہ ارے میاں تین کوس کیوں گئے۔ میرے پچھواڑے کے پیپل کی پیپلیاں کیوں نہ کھالیں۔ چودہ طبق روشن ہو جاتے۔

(۵۶) بعض بعض شاگردوں نے مرزا سے کہا کہ آپ نے حضرت علی کی مدح میں بہت قصیدے اور بڑے بڑے زور کے قصیدے کہے۔ صحابہ میں سے کسی کی تعریف میں کچھ نہ کہا۔ مرزا نے ذرا تامل کر کے کہا کہ اُن میں کوئی ایسا دکھا دیجیے تو اُس کی تعریف

بھی کہہ دوں۔ مرزا صاحب کی شوخیِ طبع ہمیشہ انہیں اُس رنگ میں شور بور رکھتی تھی جس سے ناواقف لوگ انہیں الحاد کی تہمت لگا بیٹھتے۔ اور چوں کہ یہ رنگ ان کی شکل و شان پر عجیب معلوم ہوتا تھا۔ اس لیے اُن کے دوست ایسی باتوں کو سُن کر چونکتے تھے۔ جوں جوں وہ چونکتے تھے وہ اور بھی زیادہ چھینٹے اُڑاتے تھے اُن کی طبیعت سرورِ شراب کی عادی تھی۔ لیکن اُسے گناہِ الٰہی سمجھتے تھے اور یہ بھی عہد تھا کہ محرم میں ہرگز نہ پیتے تھے۔

(۵۷) بھوپال سے ایک شخص دلّی کی سیر کو آئے۔ مرزا صاحب کے بھی مشتاقِ ملاقات تھے چنانچہ ایک دن ملنے کو تشریف لائے وضع سے معلوم ہوتا تھا کہ نہایت پرہیزگار اور پارسا شخص ہیں اُن سے بکمالِ اخلاق پیش آئے۔ مگر معمولی وقت تھا۔ بیٹھے سرور کر رہے تھے گلاس اور شراب کا شیشہ آگے رکھا تھا۔ اُس بیچارہ کو کچھ خبر نہ تھی۔ کہ آپ کو یہ شوق بھی ہے انہوں نے کسی شربت کا شیشہ خیال کر کے ہاتھ میں اُٹھا لیا۔ کوئی شخص پاس سے بولا کہ جناب یہ شراب ہے۔ بھوپالی صاحب نے جھٹ شیشہ ہاتھ سے رکھ دیا۔ اور کہا کہ میں نے تو شربت کے دھوکے میں اُٹھایا تھا مرزا صاحب نے مسکرا کر اُن کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ زہے

نصیب دھوکے میں نجات ہوگئی۔"

(۵۸) جاڑے کا موسم تھا۔ ایک دن نواب مصطفیٰ خاں صاحب مرزا کے گھر آئے۔ آپ نے ان کے آگے شراب کا گلاس بھر کر رکھ دیا وہ ان کا مُنہ دیکھنے لگے۔ آپ نے فرمایا کہ لیجئے۔ چوں کہ وہ تائب ہو چکے تھے۔ اُنہوں نے کہا کہ میں نے تو توبہ کی۔ آپ متعجّب ہو کر بولے کہ ہیں کیا جاڑے میں بھی ؟

(۵۹) ایک لالہ صاحب جن کا نام مصری لال تھا۔ مرزا صاحب کے پاس آئے اور شمع کی فرمائش کی آپ نے فی البدیہ فرمایا

ع "بہ از قندِ سیاہ مصری لال"۔

(۶۰) مرزا صاحب کی اہلیہ بڑی صاحبِ تقویٰ اور نمازن تھیں اکثر اوقات اوراد و وظائف میں مصروف و مشغول رہتی تھیں۔ مرزا صاحب نے ایک دن خوش طبعی سے کہا "سنو بیوی! بات صاف اچھی۔ تم ٹھیریں نمازن تم سیدھی جنّت میں جاؤ گی رہے ہم سو دوزخ کے کُندے نہیں گے۔ تم کہیں ہو گی، ہم کہیں یہ بندھی بات ہے تو بہتر ہو کہ دُنیا ہی میں تم کوئی اچھا سا متّقی اور پرہیز گار مولوی اپنے لیے تلاش کر لو۔

(۶۱) میاں عبد العزیز خاں صاحب[1] ایک مرد بزرگ صاحبِ نسبت

[1] فرّاش خانے کی کھڑکی میں رہتے تھے ۱۲۔

فقیر تھے۔ ذوقِ[1] مرحوم بھی اُن سے بہت اعتقاد رکھتے تھے۔ اس عالم میں ایک دن اُن کے پاس گئے۔ اور کہا کہ تخت نشینی سے پہلے حضور کے بڑے بڑے وعدے تھے۔ لیکن اب یہ عالم ہے کہ الف کے نام ب نہیں جانتے۔ زبان تک درست نہیں۔ مگر جو کچھ ہیں مرزا مغل بیگ ہیں۔ اُنھوں نے کہا کہ خدائی کے کارخانے میں اگرچہ عقل ظاہر بیں کام نہیں کرتی مگر یہ دیکھو کہ جو دولت تم کو دی ہے وہ اُس کو بھی تو نہیں دی ہے جس دعوے سے تم دربار میں کھڑے ہو کر اپنا کلام پڑھتے ہو۔ اُس دعوے سے وہ اپنی وزارت کے مقام پر کب کھڑا ہو سکتا ہوگا۔ ادنیٰ ادنیٰ منشی متصدی اُس کے لکھنے پڑھنے ہونگے

---

[1] ملک الشعراء خاقانیِ ہند شیخ ابراہیم ذوق ۱۱ ذی الحجہ سنہ ۱۲۰۴ھ کو دہلی میں پیدا ہوئے مرزا ابو ظفر بہادر شاہ بادشاہ کے اُستاد تھے اُنیس برس کی عمر میں "خاقانیِ ہند" کا خطاب عطا ہوا وفات ۲۴ صفر سنہ ۱۲۷۱ھ بروز پنجشنبہ مرنے سے تین گھنٹے پہلے یہ شعر کہا تھا ۔ کہتے ہیں ذوق آج جہاں سے گزر گیا۔ کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے۔ دہلی۔ قدم شریف کلو کے تکیے میں آسودہ ہیں۔ سنگِ باسی کی لوح پر یہ قطعہ کندہ ہے۔ لوحِ مزار

طوطیِ ہند حضرتِ اُستاد ذوق نے ＊ لی گلشنِ جہاں سے جو باغِ جناں کی راہ

سالِ وفات جو کوئی پوچھے تو اے ظفر ＊ کہہ ذوق جنتی ز سرِ بخشش الٰہ

۱۲۷۱ ہجری

وہ کیسا ترستا ہوگا کہ نہ اُن کے لکھے کو سمجھ سکتا۔ نہ اُن کا جھوٹ سچ معلوم کرسکتا ہی۔ شیخ مرحوم نے اُن کی ہدایت کو تسلیم کیا اور پھر کبھی شکایت نہ کی۔

(۴۳) عمر بھر اپنے ہاتھ سے جانور ذبح نہیں کیا۔ عالمِ جوانی کا ذکر کرتے تھے کہ یاروں میں ایک مجرّب نسخہ قوتِ باہ کا بڑی کوششوں سے ہاتھ آیا۔ شریک ہوکر اُس کے بنانے کی صلاح ٹھیری۔ ایک ایک جُزکا بہم پہنچانا ایک ایک شخص کے ذمہ ہوا۔ چنانچہ ہم چڑوں کا سقر ہمارے سر ہوا۔ ہم نے گھر آکر اُن کے پکڑنے کے سامان پھیلا دیے۔ اور دو تین چڑے پکڑ کر ایک پنجرے میں ڈالے اُن کا پھڑکنا دیکھ کر خیال آیا کہ ایسا ہم ایک پل کے پل مزے کے لیے ہم بے گناہوں کا مارنا کیا انسانیت ہی۔ یہ بھی تو آخر جان رکھتے ہیں اور اپنی پیاری زندگی کے لیے ہر قسم کی لذتیں رکھتے ہیں۔ اُسی وقت اُٹھا۔ اُنہیں چھوڑ دیا۔ اور سب سامان توڑ پھوڑ کر یاروں میں جاکر کہہ دیا کہ بھئی ہم اس نسخہ میں شریک نہیں ہوتے۔

ان کی عادت تھی کہ ٹہلتے بہت تھے۔ دروازے کے آگے لمبی گلی تھی اکثر اُس میں پھرا کرتے تھے۔ رات کے وقت ٹہلتے ٹہلتے آئے اور کہنے لگے کہ میاں ابھی ایک سانپ گلی میں چلا جاتا تھا۔ حافظ غلام رسول

دیران شاگرد رشید بھی بیٹھے تھے۔ اُنھوں نے کہا کہ حضرت پھر آپ نے اُسے مار نہیں؟ کسی کو آواز دی ہوتی۔ فرمایا کہ خیال تو مجھے بھی آیا تھا۔ مگر پھر میں نے کہا کہ ابراہیم آخر یہ بھی تو جان رکھتا ہی۔ تجھے کی رکعت کا ثواب ہوگا۔ پھر یہ قطعہ پڑھا۔ ؎

چہ گفت فردوسیٔ پاک زاد ٭ کہ رحمت براں تربتِ پاک باد

میازار مورے کہ دانہ کش است ٭ کہ جاں دارد وجانِ شیریں خوش است

(۶۳) ایک دفعہ برسات کا موسم تھا۔ بادشاہ قطب میں تھے۔ یہ ہمیشہ ساتھ ہوتے تھے اُس وقت قصیدہ لکھ رہے تھے۔ ع

"شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت"

چڑیاں سائے بان میں تنکے رکھ کر گھونسلا بنا رہی تھیں۔ اور اُن کے تنکے جو گرتے تھے اُنہیں لینے کو بار بار ان کے آس پاس آبیٹھتی تھیں۔ یہ عالمِ محویت میں بیٹھے تھے۔ ایک چڑیا سر پر آن بیٹھی اُنھوں نے ہاتھ سے اُڑا دیا۔ تھوڑی دیر میں پھر آن بیٹھی۔ اُنھوں نے پھر اُڑا دیا۔ جب کئی دفعہ ایسا ہوا۔ تو ہنس کر کہا کہ اس غیبانی نے میرے سر کو کبوتروں کی چھتری بنایا ہی۔ ایک طرف آزاد بیٹھے تھے ایک طرف حافظ ویران بیٹھے تھے۔ وہ نابینا تھے۔ اُنھوں نے پوچھا کہ حضرت کیا ہ؟ میں نے حال بیان کیا۔ ویران بولے کہ ہمارے

سر پر تو نہیں بیٹھتی۔ استاد نے کہا کہ بیٹھے کیوں کر؟ جانتی ہو کہ یہ ملّا ہو۔ عالم ہو۔ حافظ ہو۔ ابھی اُحِلَّ لَکُمُ الصَّیدُ[1] کی آیت پڑھکر کُلُوا وَاشْرَبُوا[2]۔ بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰہُ اَکْبَر کر دے گا۔ دیوانی ہو؟ جو تمہارے سر پر آئے۔

(۶۴) ایک دفعہ شیخ مرحوم نے مشاعرے میں غزل پڑھی مطلع تھا
نرگس کے پھول بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کر * ایجاد یہ ہو کہ بھیج دے آنکھیں نکال کر
شاہ صاحب نے کہا کہ میاں ابراہیم پھول بٹوے میں نہیں ہوتے یہ کہو ع "نرگس کے پھول بھیجے ہیں دونے میں ڈال کر"
اُنھوں نے کہا کہ دونے میں رکھنا ہوتا ہو ڈالنا نہیں ہوتا۔ یوں کہیئے کہ
بادام دو جو بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کر * ایجاد یہ ہو کہ بھیج دے آنکھیں نکال کر

(۶۵) شاہ نصیر مرحوم کے ہاں سال بسال ایک عرس ہوا کرتا تھا۔ اُس میں بعد فاتحہ کے کھچڑی کھلایا کرتے تھے۔ حسب معمول ذوق بھی گئے۔ فاتحہ کے بعد سب کھانا کھانے بیٹھے۔ شاہ صاحب ایک ہاتھ میں چمچہ دوسرے میں ایک بادیہ لیئے ہوئے آئے۔ بادیئے میں دہی تھا کہ خاص خاص اشخاص کے سامنے ڈالتے آتے تھے۔ اِن کے سامنے آکر کھڑے ہوئے اور چمچہ بھرا۔ انہیں ریزش ہو رہی تھی۔ بہ ہنر کے خیال سے پوچھا کہ یہ کیا ہو؟ شاہ صاحب

[1] شکار تمہارے لیئے حلال ہو۔ [2] کھاؤ اور پیو۔ ۱۲

نے کہا۔ سنکھیا ہی سنکھیا دیکھو کھاؤ گے تو مر جاؤ گے۔ ذوق ہنس دیئے اور کہا کہ ع

"بھلا تم زہر دے دیکھو اثر ہووے تو میں جانوں"

اگرچہ یہ مصرع قدیمی میاں مجذوب کا ہی۔ مگر چوں کہ کھانے کا موقع تھا اس لیئے سب کو بہت مزا دیا۔

(۶۶) ایک دن معمولی دربار تھا۔ ذوق بھی حاضر تھے۔ ایک مرشد زادے تشریف لائے وہ شاید کسی اور مرشد زادی کی یا بیگمات میں سے کسی بیگم صاحب کی طرف سے کچھ عرض لے کر آئے تھے اُنھوں نے آہستہ آہستہ بادشاہ سے کچھ کہا اور رخصت ہوئے۔ حکیم احسن اللہ خاں بھی موجود تھے۔ اُنھوں نے عرض کی صاحب عالم اس قدر جلدی ہ یہ آنا کیا تھا اور تشریف لے جانا کیا تھا۔ صاحب عالم کی زبان سے اس وقت نکلا کہ اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے بادشاہ نے ذوق کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ اُستاد! دیکھنا کیا صاف مصرع ہوا ہی۔ ذوق نے بے توقف عرض کی کہ حضور ؎

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے ٭ اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

(۶۷) ایک دن دربار سے آکر بیٹھے تھے۔ جو آزاد پہنچے۔ افسردہ ہو کر کہنے لگے کہ آج عجیب ماجرا گزرا۔ میں حضور میں گیا تو محل میں تھے

وہیں بلا لیا اور مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے۔ اُستاد آج مجھے دیر تک
ایک بات کا افسوس رہا۔ میں نے حال پوچھا کہا کہ وہ جو قصیدہ تم
نے ہمارے لیے کہا تھا۔ اُس کے وہ اشعار آج مجھے یاد آ گئے
اُن کے خیالات سے طبیعت کو عجیب لطف حاصل ہوا۔ مگر ساتھ
ہی خیال آیا کہ اب تم یہ قصیدے ہمارے لیے کہتے ہو۔ ہم مر جائیں گے
تو جو تخت پہ بیٹھے گا اُس کے لیے کہو گے۔ میں نے عرض کی کہ حضور
کچھ تردد نہ فرمائیں۔ خیمہ پیچھے گرتا ہے میخیں اور طنابیں پہلے ہی اُکھڑ جاتی
ہیں ہم حضور سے پہلے ہی اُٹھ جائیں گے۔ اور حضور خیال فرمائیں
کہ عرش آرامگاہ کے دربار کے لوگ حضور کے دربار میں کہاں تھے؟
فردوس منزل کے امراء ان کے عہد میں کہاں تھے۔ عرش منزل
کے فردوس منزل کے دربار میں کہاں تھے۔ فردوس منزل کے امیر
عرش آرامگاہ کے دربار میں کہاں تھے۔ عرش آرامگاہ کے اُمراء
آج حضور کے دربار میں کہاں ہیں! بس یہی خیال فرمائیے جو
جس کے ہوتے ہیں وہ اُسی کے ساتھ جاتے ہیں۔ نیا میر مجلس نئی
ہی مجلس جماتا ہے اور اپنا سامانِ مجلس بھی اپنے ساتھ ہی لاتا ہے۔ یہ سُن
کر حضور بھی آبدیدہ ہوئے۔ میں بھی آبدیدہ ہوا مگر خیال مجھے یہ آیا
کہ دیکھو ہم ہمیشہ نماز کے بعد حضور کی سلامتی کی دعائیں مانگتے ہیں

خدا شاہد ہے اپنا خیال اس طرح آج تک کبھی نہیں آیا۔ حضور کو ہمارا خیال بھی نہیں۔ میاں! دنیا میں کوئی کسی کا نہیں۔

(۶۸) شیخ مرحوم ضعف جسمانی کے سبب سے روزہ نہ رکھتے تھے مگر اس پر بھی کسی کے سامنے کھاتے پیتے نہ تھے۔ کبھی دوا یا شربت یا پانی بھی پینا ہوتا تو کوٹھے پر جا کر یا گھر میں جا کر پی آتے۔ ایک دفعہ آزاد نے پوچھا۔ کہا کہ میاں خدا کے گنہگار رہیں۔ وہ عالم نہان و آشکار کا ہے اُس کی تو شرم نہیں ہو سکتی۔ بھلا بندے کی تو شرم رہے۔

(۶۹) رمضان کا مہینا تھا۔ گرمی کی شدّت۔ عصر کا وقت۔ نوکر نے شربت نیلوفر کٹورے میں گھول کر کوٹھے پر طیّار کیا۔ اور کہا کہ ذرا اوپر تشریف لے چلیئے۔ چونکہ ذوق اُس وقت کچھ لکھوا رہے تھے۔ مصروفیت کے سبب سے نہ سمجھے اور سبب پوچھا۔ اُس نے اشارہ کیا۔ فرمایا کہ لے آ۔ یہ ہمارے یار ہیں اِن سے کیا چھپانا۔ جب اُس نے کٹورا لا کر دیا تو یہ مطلع کہا کہ فی البدیہ واقع ہوا تھا ؎

پلائے آشکارا ہم کو کس کی ساقیا چوری
خدا کی جب نہیں چوری تو پھر بندے کی کیا چوری

(۷۰) محبوب علی خاں خواجہ سرا سرکار بادشاہی میں مختار تھے اور

کیا محل کیا دربار دونوں جگہ اختیارِ قطعی رکھتے تھے۔ مگر بشدّت جُوا کھیلتے تھے کسی بات پر ناخوشی ہوئی۔ میاں صاحب نے حج کا ارادہ کیا۔ ایک دن آزاد ذوقِ مرحوم کے پاس بیٹھے تھے کہ کسی شخص نے آکر کہا میاں صاحب کعبۃ اللہ جاتے ہیں۔ آپ ذرا تامل کرکے مسکرائے اور یہ مطلع پڑھا۔ ؎

جو دل قمار خانہ میں بت سے لگا چکے * وہ کعبتین چھوڑ کے کعبہ کو جا چکے

(۷۱) مولینا آزاد کے والد نے بہ نیتِ وقف امام باڑہ تعمیر کیا۔ ایک دن تشریف لائے۔ اُن سے تاریخ کے لیئے کہا۔ اُسی وقت تامّل کرکے کہا "تعزیت گاہِ امامِ دارین" پوری تاریخ ہے۔

(۷۲) حکیم میر فیض علی مرحوم ان کے اُستاد بھی تھے اور اُنہی کا آپ علاج بھی کیا کرتے تھے۔ ایک دن آزاد بھی موجود تھے۔ نوکر نے آکر کہا کہ آج میر فیض علی کا انتقال ہوا۔ بار بار پوچھا اور ایسا اضطرار ہوا کہ اُٹھ کر ٹہلنے لگے۔ کچھ سوچ کر دفعتہً بولے کہ ہائے میر فیض علی آزاد سے کہا کہ دیکھو تو یہی تاریخ ہی ہ حساب کیا تو عدد برابر تھے۔

(۷۳) ایک شخص نے آکر کہا کہ میرے دوست کا نام غلام علی ہی۔ اور باپ کا نام غلام محمد ہی۔ اُس نے نہایت تاکید سے فرمایش لکھی ہی کہ حضرت سے ایسا سجع کہوا دو کہ جس میں دونوں نام آجائیں۔ آپ نے

سُن کر وعدہ کیا اور کہا کہ دو تین دن میں آپ آیئے گا۔ انشاءاللہ ہو جاوے گا۔ وہ رخصت ہو کر چلے۔ ڈیوڑھی کے باہر نکلے ہونگے جو نوکر سے کہا کہ "محمد بخش بُلا نا انہیں لینا لینا۔ خوب ہوا آج تقاضے سے جلدی مُخلصی ہو گئی" شہزادے سے مخاطب ہو کر کہا ع

"پدر غلام محمدؐ پسر غلام علیؓ"

(۷۴) دیوان چند ولال نے ان کا کلام سُن کر مصرع طرح بھیجا اور بلا بھیجا۔ آپ نے غزل کہہ کر بھیجی اور مقطع میں لکھا۔

آج کل گرچہ دکن میں ہی بڑی قدرِ سخن
کون جائے ذوق پر دلّی کی گلیاں چھوڑ کر

اُنہوں نے خلعت اور پانسو روپئے بھیجے۔ مگر یہ نہ گئے۔

(۷۵) **نقل**۔ کوئی مسافر دلّی میں مہینہ بیس دن رہ کر چلا۔ یہاں ایک کُتّا ہل گیا تھا۔ وہ وفا کا مارا ساتھ ہو لیا۔ شاہدرے پہنچ کر دلّی یاد آئی اور رہ گیا۔ وہاں کے کُتّوں کو دیکھا گردنیں فربہ۔ بدن طیار چکنی چکنی پشم۔ ایک کُتّا انہیں دیکھ کر خوش ہوا۔ اور دلّی کا سمجھ کر بہت خاطر کی۔ حلوائیوں کے بازار میں لے گیا۔ حلوائی کی دوکان سے ایک بالوشاہی اُڑا کر سامنے رکھا۔ بھٹیارے کی دکان سے ایک کلہ جھپٹا۔ یہ ضیافتیں کھاتے اور دلّی کی باتیں سُناتے

رہے۔ تیسرے دن رخصت مانگی۔ اُس نے رد کا۔ انہوں نے
دلّی کے سیر تماشے اور خوبیوں کے ذکر کیے۔ آخر چلے اور دوست
کو بھی دلّی آنے کی تاکید کر آئے۔ اُسے بھی خیال رہا اور ایک
دن دلّی کا رخ کیا۔ پہلے ہی مرگھٹ کے کُتّے مردار خوار خونی آنکھیں
کالے کالے مُنہ نظر آئے۔ یہ لڑتے بھڑتے نکلے۔ دریا ملا۔ دیر تک
کنارے پر پھرے۔ آخر کُود پڑے۔ مرکھپ کر پار پہنچے۔ شام
ہوگئی تھی۔ شہر میں گلی کُوچوں کے کُتّوں سے بچ بچا کر ڈیڑھ پہر
رات گئی تھی جو دوست سے ملاقات ہوئی۔ یہ بے چارے اپنی حالت
پر شرمائے بظاہر خوش ہوئے اور کہا اوہو اس وقت تم کہاں؟
دل میں کہتے تھے کہ رات نے پردہ رکھا ورنہ دن کو یہاں کیا
دھرا تھا۔ اُسے لے کر اِدھر اُدھر پھرنے لگے۔ یہ چاندنی چوک ہے۔
یہ دریبہ ہے۔ یہ جامع مسجد ہے۔ مہمان نے کہا۔ یار بھوک کے مارے
جان نکلی جاتی ہے۔ سیر ہو جائے گی۔ کچھ کھلواؤ تو سہی۔ اُنہوں نے کہا
عجب وقت تم آئے ہو اب کیا کروں۔ بارے جامع مسجد کی سیڑھیوں
پر جانی کبابی مرچوں کی ہانڈی بھول گئے تھے۔ اُنہوں نے کہا
لو یار بڑی قسمت والے ہو وہ دن بھر کا بھوکا تھا۔ مُنہ پھاڑ کر گرا۔
اور ساتھ ہی مُنہ سے مغز تک گویا بارود اُڑ گئی۔ چھینک کر پیچھے ہٹا

اور جل کر کہا واہ یہی دلّی ہے! انہوں نے کہا اس چٹخارے ہی کے مارے تو پڑے ہیں۔"

(۷۶) عادت تھی کہ سات آٹھ بجے مکان ضرور جاتے تھے۔ اور تین چار چلمیں حقّہ کی وہاں پیتے تھے۔ آزاد چھٹّی کے دن اُس وقت جایا کرتے تھے اور دن بھر وہیں رہتے تھے۔ مکانِ ضرور ڈیوڑھی ہیں تھا۔ پاؤں کی آہٹ پہچانتے تھے۔ پوچھتے کہ تم ہو؟ آزاد تسلیم عرض کرتے۔ چھوٹی سی انگنائی تھی۔ پاس ہی چارپائی، وہیں بیٹھ جاتے۔ فرماتے۔ اجی ہمارا وہ شعر اُس دن تم نے کیا پڑھا تھا ایک دو لفظ اُس کے پڑھتے آزاد سارا شعر عرض کرتے فرماتے۔ ہاں اب اسے یوں بنالو۔ ایک دن ہنستے ہوئے پاخانے سے سے نکلے۔ فرمایا کہ لوجی ۳۳ برس کے بعد آج اصلاح دینی آئی ہے۔ حافظ ویران نے کہا حضرت کیوں کر؟ فرمایا۔ ایک دن شاہ نصیر مرحوم کسی شاگرد کو اصلاح دے رہے تھے۔ اُس یہ مصرع تھا۔ ع "کھاتی کمر ہے تین بل اک گدگدی کے ساتھ"

ابتدائے مشق تھی۔ اتنا خیال میں آیا کہ یہاں کچھ اور ہونا چاہیئے اور جب سے اکثر یہ مصرع کھٹکتا رہتا تھا۔ آج وہ نکتہ حل ہوا۔ عرض کی حضرت پھر کیا؟ فرمایا۔ ع

ع "کھاتی ہے تین تین بل اک گُدگُدی کے ساتھ"

کمر کو اوپر ڈال دو۔ عرض کی پھر وہ کیوں کر۳۔ ہم مصرع اُلٹ پلٹ کر کہے تھے۔ ایک اس وقت خیال میں ہے ؎

بل ہے کمر کہ زلفِ مسلسل کے بیچ میں ٭ کھاتی ہے تین تین بل اک گُدگُدی کے ساتھ

(۷۷) کابلی دروازہ پاس ہی تھا۔ شام کو باہر نکل کر گھنٹوں ٹہلتے تھے۔ آزاد اکثر ساتھ ہوتے تھے۔ مضامینِ کتابی۔ خیالاتِ علمی سے افادہ فرماتے۔ شعر کہتے۔ ایک دن بادشاہ کی غزل کہہ رہے تھے تیر ہمیشہ۔ تصویر ہمیشہ۔ سوچتے سوچتے آزاد سے کہنے لگے۔ تم بھی تو کچھ کہو۔ اُنہوں نے کہا کیا عرض کروں فرمایا میاں! اسی طرح آتا ہے۔ ہوں ہاں۔ غوں غاں کچھ تو کہو کوئی مصرع ہی ہی میں نے کہا ع

"سینے سے لگائے تری تصویر ہمیشہ"

ذرا تامّل کرکے کہا ہاں درست ہے ؎

آجائے اگر ہاتھ تو کیا چین سے رہیے ٭ سینے سے لگائے تری تصویر ہمیشہ

(۷۸) ایک دن ٹہل رہے تھے۔ حافظ ویران ساتھ تھے۔ بہ تقاضے استنجا بیٹھ گئے۔ اور وقتِ معیّن سے زیادہ دیر ہوئی۔ اُنہوں نے قریب جاکر خیال کیا۔ تو کچھ گُنگنا رہے ہیں اور ڈھیلی سے جوتی پر کھٹ کھٹ کرتے جاتے ہیں۔ پوچھا کہ ابھی آپ فارغ نہیں ہوئے

فرمایا کہ حضور نے چلتے ہوئے ایک ٹھمری کے دو تین انترے سُنائے تھے۔ کہ اسے پورا کر دینا۔ اس وقت اُس کا خیال آگیا۔ پوچھا کہ یہ جوتی پر آپ چٹکی کیوں مارتے تھے؟ فرمایا کہ دیکھتا تھا اس کے لفظ تال پر ٹھیک بیٹھتے ہیں یا نہیں۔

(۷۹) حافظ ویران کہتے ہیں۔ ایک دن عجیب تماشہ ہوا ذوق بادشاہ کی غزل کہہ رہے تھے۔ مطلع ہوا کہ ؎

ابرو کی اُس کے بات ذرا ہل کے تھم گئی * تلوار آج ماہِ لقا چل کے تھم گئی

دو تین شعر ہوئے تھے کہ خلیفہ اسمٰعیل دربار سے پھر کر آئے اور کہا کہ اس وقت عجب معرکہ دیکھا۔ ذوقِ مرحوم متوجہ ہوئے انھوں نے کہا کہ جب میں بھوانی شنکر کے چھتے کے پاس پونہچا تو کھاری باؤلی کے رخ پر دیکھا کہ دو تین آدمی کھڑے ہیں اور آپس میں تکرار کر رہے ہیں۔ باتوں باتوں میں ایسی بگڑی کہ تلوار کھچ گئی اور دو تین آدمی زخمی بھی ہوئے۔ یہاں چوں کہ غزل کے شعر حافظ ویران سُن رہے تھے۔ ہنس کر بولے کہ حضرت آپ کیا وہاں موجود تھے آہستہ سے فرمایا کہ نہیں بیٹھے بیٹھے سب کچھ ہو جاتا ہی اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ اُنھیں کرامات تھی یا وہ غیب داں تھے۔ ایک حُسنِ اتفاق تھا۔ اہلِ ذوق

کے لطف طبع کے لئے لکھ دیا۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ ایک دن حضور میں غزل ہوئی جس کا مطلع تھا ؎

آج ابرو کی ترے تصویر کھنچ کر رہ گئی * سنتے ہیں بھوپال میں شمشیر کھنچ کر رہ گئی

پھر معلوم ہوا کہ اُسی دن بھوپال میں تلوار چلی تھی۔

(۸۰) ایک دفعہ دوپہر کا وقت تھا۔ باتیں کرتے کرتے سو گئے۔ آنکھ کھلی تو فرمایا کہ ابھی خواب میں دیکھا کہیں آگ لگی ہے۔ اتنے میں خلیفہ صاحب آئے اور کہا کہ پیر بخش سوداگر کی کوٹھی میں آگ لگ گئی تھی۔ بڑی خیر ہوئی کچھ نقصان نہیں ہوا۔

(۸۱) ایک شب ذوق آزاد کے والدِ مرحوم کے پاس آکر بیٹھے۔ کہا کہ بادشاہ کی غزل کہنی ہے لاؤ یہیں کہہ لیں۔ کئی فرمائشیں تھیں۔ اُن میں سے یہ طرح کہنی شروع کی۔ محبت کیا ہے۔ صورت کیا ہے۔ مصیبت کیا ہے آزاد نے کہا کہ حضرت۔ زمین شگفتہ نہیں۔ سکوت کر کے فرمایا "وہ کہنے والے شگفتہ کر ہی لیا کرتے ہیں!" پھر یہ دو مطلع پڑھے ؎

نہ بھول اے آرسی گر یار کو تجھ سے محبت ہے * نہیں ہے اعتبار اس کا یہ مُنہ دیکھے کی اُلفت ہے

بگولے سے جسے آسیب اور سر عرز حمت ہے * ہماری خاک یوں برباد ہو اے ابر رحمت ہے

(۸۲) اتفاق۔ ذوق فرماتے تھے۔ کہ ایک دن بادشاہ نے غزل کا مسودہ دیا اور فرمایا کہ اسے ابھی درست کر کے دے جانا۔ موسم برسات

کا تھا۔ ابر آرہا تھا۔ دریا چڑھاؤ پر تھا۔ میں دیوان خاص میں جاکر
اُسی رُخ پر ایک طرف بیٹھ گیا اور غزل لکھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے
بعد پاؤں کی آہٹ معلوم ہوئی۔ دیکھا تو پشت پر ایک صاحب
دانائے فرنگ کھڑے ہیں۔ مجھ سے کہا آپ کیا لکھتا ہے؟ میں نے
کہا غزل ہے۔ پوچھا آپ کون ہے؟ میں نے کہا کہ نظم میں حضور کی
دعاگوئی کیا کرتا ہوں۔ فرمایا کس زبان میں؟ میں نے کہا اُردو میں
پوچھا آپ کیا کیا زبانیں جانتا ہے؟ میں نے کہا فارسی عربی بھی
جانتا ہوں۔ فرمایا اُن زبانوں میں بھی کہتا ہے؟ میں نے کہا کوئی
خاص موقع ہو تو اُس میں بھی کہنا پڑتا ہے ورنہ اُردو ہی میں کہتا
ہوں کہ یہ میری اپنی زبان ہے۔ جو کچھ انسان اپنی زبان میں
کرسکتا ہے غیر کی زبان میں نہیں کرسکتا۔ پوچھا آپ انگریزی
جانتا ہے؟ میں نے کہا نہیں۔ فرمایا کیوں نہیں پڑھا؟ میں نے
کہا کہ ہمارا لب و لہجہ اُس سے موافق نہیں وہ ہمیں آتی نہیں ہے۔
صاحب نے کہا وِل یہ کیا بات ہے۔ دیکھیے ہم آپ کا زبان بولتا
ہے۔ میں نے کہا پختہ سالی میں غیر زبان نہیں آسکتی۔ بہت مشکل
معاملہ ہے۔ اُنھوں نے پھر کہا کہ وِل ہم آپ کا تین زبان ہندوستان
میں آکر سیکھ لیا۔ آپ ہمارا ایک زبان نہیں سیکھ سکتا۔ یہ کیا بات ہے؟

اور تقریر کو طول دیا۔ میں نے کہا صاحب ہم زبان کا سیکھنا اُسے کہتے ہیں کہ اُس میں بات چیت ہر قسم کی تحریر تقریر اس طرح کریں جس طرح خود اہلِ زبان کرتے ہیں آپ فرماتے ہیں" ہم آپ کا تین زبان سیکھ لیا" بھلا یہ کیا زبان ہے اور کیا سیکھنا ہے۔ اسے زبان کا سیکھنا اور بولنا نہیں کہتے۔ اسے تو زبان کا خراب کرنا کہتے ہیں۔"

(۸۳) لطیفہ۔ سلطان جی صاحب کے ہاں ایک سیّاح فقیر مہمان آئے رات کو دسترخوان پر بیٹھے کھانے کے بعد باتیں شروع ہوئیں سیّاح نے ایسے دفتر کھولے کہ بہت رات گئی ختم ہی نہ ہوں۔ سلطان جی صاحب نے کچھ انگڑائیاں کچھ جمائیاں بھی لیں۔ وہ سادہ لوح کسی طرح نہ سمجھے۔ سلطان جی صاحب مہمان کی دل شکنی سمجھ کر کچھ کہہ نہ سکے۔ مجبور بیٹھے رہے۔ امیر خسرو بھی موجود تھے مگر بول نہ سکتے تھے۔ کہ آدھی رات کی نوبت بجی۔ اس وقت سلطان جی نے کہا کہ خسرو یہ کیا بجا؟ عرض کی آدھی رات کی نوبت ہے۔ پوچھا اس میں کیا آواز آتی ہے؟ انہوں نے کہا مجھے تو ایسا آتا ہے:۔

نان کہ خوردی خانہ برو۔ نان کہ خوردی خانہ برو۔ خانہ برو خانہ برو
نان کہ خوردی خانہ برو۔ نہ کہ بدستِ تو کردم خانہ گرو۔ خانہ برو خانہ برو۔

حرف حرف کی حرکت و سکون پر خیال کرو۔ ایک ایک چوٹ کو کیا پورا پورا ادا کر رہے ہیں اور نہ کہ بدستِ تو کردم خانہ گرد۔ کو دیکھو۔ اس نے کیا کام کیا۔

(۸۴) نقل۔ ایک دن کسی کوچے میں سے گزرا ہوا۔ دھنیا ایک دکان میں روئی دھنک رہا تھا۔ کسی نے کہا کہ جس دھنیئے کو دیکھو ایک ہی انداز پر روئی دھنکتا ہے سب ایک ہی اُستاد کے شاگرد ہیں! کوئی بولا کہ قدرتی اُستاد نے سب کو ایک ہی انداز پر سکھایا ہے۔ امیر خسرو نے کہا کہ سکھایا ہے اور ایک حرکت میں بھی تال کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ کوئی بولا کہ لفظوں میں کیوں کر لاسکیں۔ فرمایا۔ در پئے جاناں جاں ہم رفت۔ جاں ہم رفت۔ جاں ہم رفت۔ رفت۔ جاں ہم رفت۔ ایں ہم رفت۔ آں ہم رفت۔ آنہم رفت۔ آنہم رفت۔ اینہم آنہم۔ اینہم۔ آنہم۔ آنہم رفت۔ رفتن۔ رفتن۔ رفتن دہ۔ دہ۔ دہ۔ دہ۔ رفتن دہ۔ رف۔ رف۔ رفتن دہ۔ رفتن دہ۔

(۸۵) نقل۔ محلّہ کے سرے پر ایک بڑھیا ساقن کی دکان تھی۔ چھیّو اُس کا نام تھا۔ شہر کے بیہودہ لوگ وہاں بھنگ چرس پیا کرتے تھے۔ امیر خسرو جب یہ دربار سے پھر کر آتے یا تفریحًا گھر سے نکلتے۔ تو وہ بھی سلام کرتی۔ کبھی حُقّہ بھر کر سامنے کھڑی ہوتی۔ یہ بھی اس

کی دل شکنی کا خیال کرکے دو گھونٹ سے پیا کرتے۔ ایک دن اُس نے کہا کہ بلا لوں۔ ہزاروں غزلیں۔ گیت۔ راگ۔ راگنی بناتے ہو۔ کتابیں لکھتے ہو۔ کوئی چیز لونڈی کے نام کی بھی بنا دو۔ اُنھوں نے کہا بی چھتّو بہت اچھا۔ کئی دن کے بعد اُس نے پھر کہا کہ بھٹیاری کے لڑکے کے لیئے خالق باری لکھ دی۔ ذرا لونڈی کے نام پر بھی کچھ لکھ دوگے تو کیا ہوگا۔ آپ کے صدقے سے ہمارا نام بھی رہ جائے گا۔ اس کے بار بار کہنے سے ایک دن خیال آگیا کہا لو بی چھتّو سنو

اَوروں کی چوپہری باجے چھتّو کی اٹھ پہری
باہر کا کوئی آتے ناہیں آئیں سارے شہری
صاف صوف کر آگے راکھے جس میں ناہیں تو سل
اَوروں کے جہاں سینگ سماوے چھتّو کے وہاں موسل

یعنی یہ بادشاہوں سے بھی بڑی ہیں جنگلی گنواروں کا کام نہیں سفید پوش آتے ہیں پیالہ بھنگ صاف مصفّٰی حاضر کرتی ہے جس میں خس تنکا نہ ہو بھنگڑ فخریہ کہا کرتے ہیں کہ وہ ایسی بھنگ پیتا ہے کہ جس میں گاڑھے پن کے سبب سے سینگ کھڑی رہے۔ آپ مبالغہ کرتے ہیں کہ یہ ایسی بھنگ بناتی ہے۔ کہ جس میں موسل کھڑا رہے۔ خیر اُن کی بدولت چھتّو کا بھی نام رہ گیا۔

(۸۶) شاہ کمال بخاری اُس زمانے میں ایک بہت بزرگ شخص تھے

اُن کے بیٹے پیر مکھن تھے۔ اور پاکباز تخلّص کرتے تھے۔ شاہ مبارک[1] کو ان سے بہت محبّت تھی۔ چنانچہ اکثر شعروں میں اُن کا نام یا کچھ اشارہ ضرور کرتے تھے۔ دیکھنا کیا مزے کا سجع کہا ہے۔ ع

"عالم ہمہ دروغ است و محمدؐ مکھن"

(۸۷) **خدمتگار خاں** بادشاہی خواجہ سرا تھا۔ اور سرکارِ شاہی میں بڑا صاحب اختیار تھا۔ اکثر بادشاہی نوکر اُس کی سخت گیری اور بدمزاجی سے دق رہتے تھے۔ انہیں بھی اُس سے کام پڑتا تھا۔ کبھی آسانی سے مطلب نکل آتا تھا۔ کبھی دشواری سے چنانچہ ایک موقع پر شاہ مبارک نے یہ شعر کہا ؎

یارو خدمتگار خاں خوجوں کے بیچ ٭ ہی تو مستثنیٰ ۔ ولیکن منقطع

(۸۸) ہائے **دلّی** خدا تجھے بہشت نصیب کرے، کیسے کیسے لوگ تیری خاک سے اُٹھے اور خاک میں مل گئے مولینا آزاد راوی ہیں کہ اُستادِ مرحوم (یعنی **ذوق**) نے ایک دن فرمایا کہ **شیخ مضمون**[2] کے زمانے میں کوئی امیر باہر سے محل میں آئے اور پلنگ پر لیٹ گئے۔ ایک بُڑھیا ماما نئی نوکر ہوئی تھی وہ حقّہ بھر لائی اور سامنے رکھا۔ نواب صاحب کی زبان پر اس وقت

[1] آبرو تخلّص کرتے تھے۔ نجم الدین نام تھا۔ شاہ محمد غوث گوالیاری کی اولاد میں تھے ۱۲

[2] شیخ شرف الدین، مضمون تخلّص، شیخ فرید شکر گنج کی اولاد میں تھے (بقیہ نوٹ بر صفحہ آئندہ)

(بقیہ نوٹ بر صفحہ آئندہ)

یہ مضمون کا شعر تھا ؎

ہم نے کیا کیا نہ ترے عشق میں محبوب کیا * صبر ایّوب کیا گریۂ یعقوب کیا

ماما سُن کر بولی - الٰہی تیری امان - اس گھر میں تو آپ ہی پیغمبری وقت[۱]

پڑ رہا ہی - بے چارے نوکروں پر کیا گزرے گی ؟ چلو بابا یہاں سے -

---

(بقیہ نوٹ صفحۂ گزشتہ) تاج متو علاقہ آگرہ وطن اصلی تھا۔ دلّی میں آرہے۔ اصل پیشہ سپاہ گیری تھا۔ تباہیِ سلطنت سے ہتھیار کھول کر مضمون باندھنے پر قناعت کی۔ اور زینت المساجد میں ایسے بیٹھے کہ مر کے اُٹھے۔ مرزا رفیع نے بھی ان کا عہد پایا تھا۔ چنانچہ جب انتقال ہوا تو مرزا نے غزل کہی جس کا مطلع اور مقطع یہ ہی ؎

پئے مُو اُٹھ گیا ساقی، مرا بھی پُر ہو پیمانہ * الٰہی کس طرح دیکھوں میں ان آنکھوں سے میخانہ

بنا ئیں اُٹھ گئیں یاروں غزل کے خوب کہنے کی * گیا مضمون دنیا سے سہا سودا اسو ستانہ

[۱] دلّی میں غریب مفلس فقیر کسی سے سوال کیا کرتے تھے تو کہا کرتے تھے۔ عیال دار ہیں۔ مفلس ہیں، ہم پر پیغمبری وقت پڑا ہی، اللہ کچھ دو۔ اور اصل اس کی یہ تھی کہ جس پر سخت مصیبت پڑتی ہی وہ زیادہ خدا کا پیارا ہوتا ہی۔ اور چونکہ پیغمبر سب سے زیادہ خدا کے پیارے ہیں اس لیے اُن پر زیادہ مصیبتیں پڑتی ہیں۔ جو مصیبتیں پیغمبروں پر پڑی ہیں وہ دوسرے پر نہیں پڑیں۔ رفتہ رفتہ پیغمبری وقت اور پیغمبری مصیبت کے معنے سخت مصیبت کے ہو گئے دیکھو ایسی باتیں اُس زمانے میں کس قدر عام تھیں۔ کہ بُڑھیاں عورتیں اور مامائیں اُن سے نکتے اور لطیفے پیدا کرتی تھیں اب اللہ ہی اللہ ہی - ۱۲

(۸۹) دریائے لطافت کی ایک عبارت نقل کرتا ہوں۔ سید انشا جن کی کوئی بات ظرافت سے خالی نہیں۔ ایک اپنے عہد کے بڈھے میر صاحب کی تقریر ایک کسبی کے ساتھ لکھتے ہیں۔ یہ دونوں دلّی کے رہنے والے ہیں۔ اور لکھنؤ میں باتیں کر رہے ہیں۔

بی نورن کہتی ہیں:۔

اجی آؤ میر صاحب! تم تو عید کا چاند ہو گئے۔ دلّی میں آتے تھے دو دو پہر رات تک بیٹھتے تھے اور ریختے پڑھتے تھے۔ لکھنؤ میں تمہیں کیا ہو گیا کہ کبھی صورت بھی نہیں دکھاتے۔ اب کے کربلا میں کتنا میں نے ڈھونڈا۔ کہیں تمہارا اثر آثار معلوم نہ ہوا۔ ایسا نہ کیجیو کہیں آٹھوں[۱] میں بھی نہ چلو۔ تمہیں علی کی قسم آٹھوں میں ضرور چلیو۔ اب جس رنگ سے سید انشا میر صاحب[۲] موصوف کی تصویر کھینچتے ہیں اوّل اُسے ملاحظہ فرمایئے۔ اور اتنا خیال اور بھی رہے کہ یہ پراتم دیرینہ سال۔ اس زمانے کے ایک خوش طبع رنگین مزاج شخص تھے کوئی ثقہ متقی پرہیزگار نہ تھے۔ باوجود اس کے کتنا نہ اوضاع و اطوار۔ اور نئی رفتار و گفتار پر خیالات رکھتے تھے۔

---

[۱] آٹھوں کا میلہ لکھنؤ میں بڑی دھوم کا ہوتا تھا۔ ۱۲

[۲] میر صاحب سے مراد غلام مصطفیٰ خاں یکرنگ ہیں۔ ۱۲

بیانِ صورت میر موصوف آنیکہ سیاہ رنگ، کوتاہ قد، فربہ گردن دراز گوش۔ بندشِ دستار بطور بعض قند سازانِ کہنہ۔ رنگش سبز یا اگری۔ والّا اکثر سفید۔ گاہے گلسرخ ہم در گوشۂ دستار میز تند وجامۂ مصطلح ہندوستان (نہ جامۂ لغوی) در برِ مبارک بسیار پاکیزہ مے باشد۔ چوں لباسِ باریک (ازیں جہت کہ برائے زناں مقرر است) نمے پوشند رخت پوشاکی ملازمانِ شریف ایشاں اکثر گندہ است۔ لیکن قیمت دو نیم روپیہ رایک تھان تمام دریک جامہ صرف مے شود۔ چولی زیر پستان، بالائے آں دو پٹہ پستولیہ۔ دامن بر زمین جاروب میکشد۔ ومسی ہم بر دندانِ مبارک میمالند و پاپوش از سقرلات زرد و در حاقی وسط آں ستارہ از تار ہائے طلائی غیر خالص۔ حالا کہ ہیئت معلوم شد طرزِ کلام باکسی باید شنید۔ میر صاحب فرماتے ہیں:۔

اجی بی نورن! یہ کیا بات فرماتی ہو۔ تم تو اپنے جیوڑے کی چین ہو۔ پر کیا کہیں جب سے دلّی چھوڑی ہے کچھ جی افسردہ ہو گیا ہے اور شعر پڑھنے کو جو کہو تو کچھ لطف اس میں بھی نہیں رہا کہ مجھ سے سُنئے۔ ریختے میں اُستاد میاں ولی ہوئے اِن پر توجہ شاہ گلشن صاحب کی تھی۔ پھر میاں آبرو اور میاں ناجی اور میاں حاتم

پھر سب سے بہتر مرزا رفیع السودا۔ اور میر تقی صاحب۔ پھر حضرت خواجہ میر
درد صاحب برّد اللہ مرقدہٗ جو میرے بھی اُستاد تھے وہ لوگ تو سب
مر گئے اور اُن کی قدر دانی کرنے والے بھی جاں بحق تسلیم ہوئے۔ اب
لکھنؤ کے جیسے چھوکرے ہیں ویسے ہی شاعر ہیں۔ اور دلّی میں بھی
ایسا ہی کچھ چرچا ہی۔ تخم تاثیر صحبت کا اثر۔ سبحان اللہ۔ یہ کون میاں
جرأت بڑے شاعر۔ پوچھو تو تمہارا راے مان کس دن شعر کہتا تھا
اور رضا بہادر کا کونسا کلام ہی۔ اور دوسرے میاں مصحفی کہ مطلق شعور
نہیں رکھتے۔ اگر پوچھیئے کہ ضَرَبَ زَیدٌ عَمرًا کی ترکیب تو ذرا بیان
کرو تو اپنے شاگردوں کو ہمراہ لے کر لڑتے آتے ہیں۔ اور میاں حسرت
کو دیکھو۔ اپنا عرق بادیان اور شربت انارین چھوڑ کے شاعری میں
آ کے قدم رکھا ہی۔ اور میر انشاء اللہ خاں بے چارے میر ماشاء اللہ خاں
کے بیٹے آگے پر پرزادے تھے ہم بھی گھورنے کو جاتے تھے۔ اب چند
روز سے شاعر بن گئے۔ مرزا مظہر جان جاناں صاحب کے روزمرہ
کو نام رکھتے ہیں۔ اور سب سے زیادہ ایک اور سُنیئے کہ سعادت
یار طہماسپ کا بیٹا۔ انوریِ ریختہ آپ کو جانتا ہی۔ رنگین تخلّص ہی ایک
قصّہ کہا ہی۔ اس مثنوی کا نام دل پذیر رکھا ہی رنڈیوں کی بولی اس
میں باندھی ہی۔ میر حسن پر زہر کھایا ہی۔ ہر چند اس مرحوم کو بھی کچھ شعور

نہ تھا بدرِ منیر کی مثنوی نہیں ہی گویا سانڈے کا تیل بیچتے ہیں۔ بھلا اس کو شعر کیوں کر کہیئے۔ سارے لوگ دلّی کے لکھنؤ کے رنڈی سے لے کر مرد تک پڑھتے ہیں ؎

چلی واں سے دامن اُٹھاتی ہوئی * کڑے کو کڑے سے بجاتی ہوئی

سو اُس بے چارے رنگین نے بھی اسی طور پر قصّہ کہا ہی۔ کوئی پوچھے کہ بھائی تیرا باپ رسال دار مسلّم۔ لیکن بے چارہ برچھی بھالے کا ہلانے والا تیغے کا چلانے والا تھا۔ تو ایسا قابل کہاں سے ہوا اور شہدپن جو بہت مزاج میں رنڈی بازی سے آ گیا تھا۔ تو ریختہ کے تئیں چھوڑ کر ایک ریختی ایجاد کی ہی۔ اس واسطے کہ بھلے آدمیوں کی بہو بیٹیاں پڑھ کر مشتاق ہوں۔ اور اُن کے ساتھ اپنا مُنہ کالا کریں۔ بھلا یہ کام کیا ہی ؎

ذرا گھر کو رنگین کے تحقیق کر لو * یہاں سے ہی کچھ بیسے ڈولی کہارو

مرد ہو کر کہتا ہی ع کہیں ایسا نہ ہو کمبخت میں ماری جاؤں + اور ایک کتاب بنائی ہی اس میں رنڈیوں کی بولی لکھی ہی۔ جس میں اوپر والیاں چیلیں۔ اوپر والا چاند۔ اُگلی۔ دھوبن وغیرہ وغیرہ۔ ان بزرگوں کو خیال کرو کہ مصحفی اور سید انشا۔ اور جرأت کو اپنی جگہ پر یہ کچھ کہتے تھے۔ پھر ہم اپنی بولی اور اپنی تراش اور ایجادوں کو قبولیت

دوام کا سارٹیفکٹ دے کر کس طرح نازاں ہوں؟ جو نئی اُمت ہمارے بعد آئے گی وہ خدا جانے کیا کچھ ہیں سیکھ نکالے گی۔ خیر اپنے اپنے وقت پر یوں ہی ہوا ہے اور یوں ہی ہوتا رہے گا۔

(۹۰) لطیفہ[1] شاگردوں میں ایک نوجوان بچپن سے حاضر رہتا تھا حسنِ اتفاق یہ کہ چہرہ اُس کا نمکِ حسن سے نمکین تھا۔ وہ کسی سبب سے چند روز نہ آیا۔ ایک دن یہ کہیں سرِ راہ بیٹھے تھے کہ وہ اُدھر سے گزرا۔ انہوں نے بلایا۔ شاید اسے ضروری کام تھا کہ وہ عذر کرکے چلا۔ انہوں نے پھر روکا اور بُلاکر یہ شعر پڑھا کہ لطافتِ طبع سے اسی وقت شبنم کی طرح ٹپکا تھا ؎

یہ ناز یہ غرور لڑکپن میں تو نہ تھا ✻ کیا تم جوان ہوکے بڑے آدمی ہوئے

(۹۱) لطیفہ۔ ایک دن کہیں مشاعرہ تھا۔ ایک جانب میں چند

---

[1] یہ لطیفہ سراج الدین علی خاں آرزو کا ہے۔ یہ اردو کے شاعر نہ تھے نہ اُس زمانے میں اس کو کچھ کمال سمجھتے تھے البتہ بعض متفرق اشعار کہے تھے وہ زمانے کی گردشوں سے اس طرح گھس پس کر اُڑ گئے کہ آج کل کے لوگوں کو خبر بھی نہیں۔ اصل وطن اِن کے بزرگوں کا آگرہ تھا۔ مگر یہ دلّی سے دل لگی رکھتے تھے۔ سنہ ۱۱۶۹ء میں لکھنؤ میں رحلت کی۔ لیکن ہڈیوں کی خاک دلّی میں آکر زمین کا پیوند ہوئی۔ ۱۲

فہمیدہ اور سخن شناس بیٹھے شعر و سخن سے دماغ تازہ کر رہے تھے۔ ایک شخص نے خان موصوف کی تعریف کی اور اس میں بہت مبالغہ کیا۔ حکیم اصلح الدین خاں صاحب مسکرائے اور کہا کہ ع

"آرزو خوب است اما ایں قدر ہا خوب نیست"

سب ہنسے اور خود خان صاحب دیر تک اس مصرع لطیف کی داد دیتے رہے۔ ؎

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ ٭ افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

(۹۲) لطیفہ۔ ایک دن راجہ صاحب[۵۳] کے دربار میں غزل پڑھی جس کا قافیہ تھا لائیاں اور جائیاں سب سخن فہموں نے بہت تعریف کی۔ راجہ صاحب کی صحبت میں جگنو میاں ایک مسخرے تھے۔ ان کی زبان سے نکلا کہ نواب صاحب سب قافیے آپ نے باندھے مگر تالیاں رہ گئیں۔ انہوں نے ٹال دیا اور کچھ جواب نہ دیا۔ راجہ صاحب

---

[۵۲] یہ اور اس کے بعد کے دونوں لطیفے اشرف علی خاں فغاں کے ہیں۔ احمد شاہ بادشاہ کے کوکہ تھے۔ بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی کا یہ عالم تھا کہ زبان سے پھلجھڑی کی طرح پھول جھڑتے تھے۔ "ظریف الملک کوکہ خاں" کا خطاب تھا۔ ۱۱۸۶ھ میں بمقام عظیم آباد وفات پائی۔ ۱۲

[۵۳] راجہ صاحب سے مراد عظیم آباد کے راجہ شتاب رائے ہیں جن کے ہاں اشرف علی خاں کو تعلق تھا۔ ۱۲

نے خود فرمایا کہ نواب صاحب! سنتے ہو؟ جگنو میاں کیا کہتے ہیں؟
انہوں نے کہا کہ مہاراج اس قافیے کو مبتذل سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔
اور حضور فرمائیں تو اب بھی ہو سکتا ہے۔ مہاراج نے کہا کہ ہاں کچھ کہنا
تو چاہیئے۔ انہوں نے اسی وقت پڑھا ؎

جگنو میاں کی دُم جو چمکتی ہے رات کو ٭ سب دیکھ دیکھ اُس کو بجاتے ہیں تالیاں

تمام دربار چمک اُٹھا اور میاں جگنو مدھم پڑ گئے۔
افسوس یہ ہے کہ اس قسم کے لطائف بڑھتے بڑھتے ان سے اور
راجہ صاحب سے بھی شکر رنجی ہو گئی اس کی بنیاد یہ ہوئی کہ احمد شاہ
دُرّانی نے جو سلطنت پر حملے کیے۔ ایک دن اس کی دست درازی
اور بے اعتدالیوں کا ذکر ہو رہا تھا خدا جانے طنز سے یا سادہ
مزاجی سے راجہ صاحب نے کہا کہ نواب صاحب! ملکہ زمانی کو
احمد شاہ دُرّانی کیوں کر لے گیا انہیں یہ بات ناگوار ہوئی
افسردہ ہو کر بولے کہ مہاراج جس طرح سیتا جی کو راون لے
گیا تھا۔ اسی طرح وہ لے گیا۔ اس دن سے دربار میں جانا چھوڑ دیا۔
(۹۳) نقل[1]۔ ایک دن درزی ٹوپی سی کر لایا۔ اس کی تراش ٹیڑھی تھی۔

---

[1] یہ چاروں نقلیں میر عبدالحی تاباں کی ہیں۔ یہ نہایت خوش رو جوان نہایت حسین تھے
لوگ ان کو یوسفِ ثانی کہتے تھے۔ گورا رنگ پر کالے کپڑے (بقیہ نوٹ بر صفحہ آئندہ)

اُس وقت دوسری ٹوپی موجود نہ تھی۔ اس لیئے اُسی کو پہننا پڑا۔ مگر سر میں درد ہونے لگا۔

(۹۴) **نقل**۔ جس چارپائی میں کان ہو اُس پر بیٹھا نہ جاتا تھا۔ گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ چنانچہ دلّی دروازے کے پاس ایک دن ہوادار میں سوار چلے جاتے تھے۔ راہ میں ایک بنیئے کی چارپائی کے کان پہ نظر جا پڑی۔ وہیں ٹھہر گئے اور جب تک اُس کا کان نہ نکلوا لیا آگے نہ بڑھے۔

(۹۵) **نقل**۔ ایک دن ایک نواب صاحب کہ ان کے خاندان کے مرید تھے۔ ملاقات کو آئے اور خود صراحی سے کر پانی پیا۔ اتفاقاً آبخورا جو رکھا تو ٹیڑھا رکھا۔ مرزا کا مزاج اس قدر برہم ہوا کہ ہرگز ضبط نہ ہو سکا اور بگڑ کر کہا کہ عجب بے وقوف احمق تھا جس نے

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ) بہت خوبصورت تھے ہمیشہ سیاہ پوش رہتے تھے۔ دہلی محلہ جش خاں کے پھاٹک میں رہتے تھے۔ لطافت مزاج اور سلامتی طبع کی نقلیں ایسی ہیں کہ آج سُن کر تعجب آتا ہے۔ خلاف وضع روییے اسلوب حالت کو دیکھ نہ سکتے تھے عین عالم شباب میں انتقال کیا۔ تمام شہر نے اس کا سوگ رکھا۔ میر تقی میر نے اپنی ایک غزل کے مقطع میں کہا ہے۔

داغ ہے تاباں علیہ الرحمۃ کا چھاتی پہ میرؔ ٭ ہو نجات اُس کو بچارا ہم سے بھی تھا آشنا[۱۲]

تمہیں نواب بنا دیا آبخورا بھی صراحی پر رکھنا نہیں آتا۔

(۹۴) **نقل** - مولوی غلام یحییٰ ۔ فاضل جلیل جنہوں نے میر زاہد پر حاشیہ لکھا ہے بہ ہدایتِ غیبی مرزا کے مرید ہونے کو دلّی میں آئے ان کی ڈاڑھی بہت بڑی اور گھن کی تھی۔ جمعہ کے دن جامع مسجد میں ملے اور ارادہ ظاہر کیا۔ مرزا نے ان کی صورت کو غور سے دیکھا اور کہا کہ اگر مجھ سے آپ بیعت کیا چاہتے ہیں تو پہلے ڈاڑھی کو ترشوا کر صورت بھلے آدمیوں کی بنائیے پھر تشریف لائیے۔ اَللّٰہُ جَمِیْلٌ وَیُحِبُّ الْجَمَالَ۔ عہ بھلا یہ ریچھ کی سی صورت مجھ کو اچھی نہیں معلوم ہوتی تو خدا کو کب پسند آئے گی۔ مُلّا متشرع آدمی تھے گھر میں بیٹھ رہے تین دن تک برابر خواب میں دیکھا کہ بغیر مرزا کے تمہارا عقدۂ دل نہ کھلے گا۔ آخر بیچارے نے ڈاڑھی حجّام کے سپرد کی اور جیسا خشخاشی خط مرزا صاحب کا تھا ویسا ہی رکھ کر مریدوں میں داخل ہوئے۔

(۹۵) سوداؔ[۱] کے جب کلام کا شہرہ عالمگیر ہوا تو شاہ عالم بادشاہ اپنا کلام اصلاح کے لئے دینے لگے اور فرمایشیں کرنے لگے

---

[۱] مرزا محمد رفیع نام، باپ مرزا محمد شفیع میرزایانِ کابل سے تھے۔ بزرگوں کا پیشہ سپہ گیری تھا بطریقِ تجارت واردِ ہندوستان ہوئے۔ پیدائش ۱۱۲۵ھ (بقیہ نوٹ بر صفحۂ آئندہ)

عہ اللہ تعالیٰ (خود) صاحبِ جمال ہے اور وہ خوب صورتوں کو دوست رکھتا ہے۔ ۱۲

ایک دن کسی غزل کے لیئے تقاضا کیا۔ انہوں نے عذر بیان کیا۔ حضور نے فرمایا بھئی مرزا کی غزلیں روز کہہ لیتے ہو؟ مرزا نے کہا۔ پیرومرشد جب طبیعت لگ جاتی ہی دو چار شعر کہہ لیتا ہوں۔ حضور نے فرمایا۔ بھئی ہم تو پائخانہ میں بیٹھے بیٹھے چار غزلیں کہہ لیتے ہیں ہاتھ باندھ کر عرض کی۔ ویسی بو بھی آتی ہی۔ یہ کہہ کر چلے آئے۔ بادشاہ نے پھر کئی دفعہ بلا بھیجا اور کہا کہ ہماری غزلیں بناؤ ہم تمہیں ملک الشعرا کر دیں گے۔ یہ نہ گئے اور کہا کہ حضور کی ملک الشعرائی سے کیا ہوتا ہی۔ کرے گا تو میرا کلام ملک الشعرا کرے گا۔

(۹۸) غنچہ نام ان کا ایک غلام تھا۔ ہر وقت خدمت میں رہتا تھا اور ساتھ قلم دان لیئے پھرتا تھا۔ جب کسی سے بگڑتے تو فوراً پکارتے۔ ارے غنچہ لا تو قلم دان۔ ذرا میں اس کی خبر تو لوں یہ مجھے سمجھا کیا ہی۔ پھر شرم کی آنکھیں بند۔ اور بے حیائی کا منہ کھول کر وہ وہ بے نقط سناتے تھے کہ شیطان بھی امان مانگے۔

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) ستر برس کی عمر میں ۱۱۹۵ھ میں بمقام لکھنؤ انتقال کیا۔
فخر الدین نے تاریخ کہی۔ ؎ بجائے مصحف دور کرنا عناد۔ شاعران ہند کا سرور گیا۔
۱۱۹۵ھ
مصحفی نے کہا۔ ع سودا کجا ؤ آں سخن دل فریب ادہ۔ میر قمر الدین منت نے کہا
۱۱۹۵ھ
ع بگفت گوہر معنی یتیم شد ہی۔ ۱۲
۱۱۹۵ھ

(۹۹) ایک دن لکھنؤ میں میر اور مرزا کے کلام پر دو شخصوں میں تکرار نے طول کھینچا۔ دونوں خواجہ باسط کے مرید تھے۔ انہیں کے پاس گئے اور عرض کی کہ آپ فرمائیں۔ انہوں نے کہا کہ دونوں صاحبِ کمال ہیں مگر فرق اتنا ہے کہ میر صاحب کا کلام آہ ہے اور مرزا صاحب کا کلام واہ ہے۔ مثال میں میر صاحب کا شعر پڑھا ؎

سرہانے میرے آہستہ بولو ✻ ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

پھر مرزا کا شعر پڑھا ؎

سودا کی جو بالیں پہ گیا شورِ قیامت ✻ خدّامِ ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

(۱۰۰) لطیفہ در لطیفہ۔ ان میں سے ایک شخص جو مرزا کے طرفدار تھے وہ مرزا کے پاس بھی آئے اور سارا ماجرا بیان کیا۔ مرزا بھی میر صاحب کے شعر کو سن کر مسکرائے۔ اور کہا کہ شعر تو میر صاحب کا ہے مگر درد خواہی ان کی دوا کی معلوم ہوتی ہے۔

۱؎ حکیم قدرت اللہ خاں قاسم بھی اپنے تذکرے میں میر و مرزا کے باب میں فرماتے ہیں۔ بزعم بعضے آں کہ بسمع آمد شعرے از تصنیفات مرزا محمد رفیع سودا الّا در غزل گوئی بوے نرسیدہ۔ حق آں ست کہ ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است۔ مرزا دریا ئیست بیکراں و میر نہریست عظیم الشان در معلومات ہرچند میر را بر مرزا برتریست در قوت شاعری مرزا را بر میر سروری ۔ ۱۲

(۱۰۱) مرزا فاخر مکین کے اور سودا کے نوک جھوک تو چلی ہی جاتی تھی فاخر کے شاگرد لکھنؤ میں بہت سے تھے خصوصاً شیخ زادے کہ ایک زمانے میں وہی ملک اودھ کے حاکم بنے ہوئے تھے۔ اور سینہ زوری اور سرشوری کے بخار ابھی تک دماغوں سے گئے نہ تھے۔ ایک دن سودا تو بے خبر گھر میں بیٹھے تھے وہ بلوہ کرکے چڑھ آئے۔ مرزا کے پیٹ پر چھری رکھ دی اور کہا کہ جو کچھ تم نے کہا ہے وہ سب لو اور ہمارے اُستاد کے سامنے چل کر فیصلہ کرو۔ مرزا کو مضامین کے گل پھول اور باتوں کے طوطے مینا تو بہت بنانے آتے تھے مگر یہ مضمون ہی نیا تھا۔ سب باتیں گئے۔ بے چارے نے جزدان غلام کو دیا۔ خود میانے میں بیٹھے اور ان کے ساتھ ہوئے۔ گرد وہ لشکر شیطان کھا۔ یہ بیچ میں تھے۔ چوک میں پہنچے تو انہوں نے چاہا کہ یہاں انہیں بے عزت کیجیے۔ کچھ تکرار کرکے پھر جھگڑنے لگے۔ مگر جسے خدا عزت دے اُسے کون بے عزت کرسکتا ہے۔ اتفاقاً سعادت علی خاں کی سواری آ نکلی۔ مجمع دیکھ کر ٹھیر گئے۔ اور حال دریافت کرکے سودا کو اپنے ساتھ ہاتھی پر بٹھا کر لے گئے۔ آصف الدولہ حرم سرا میں دسترخوان پر تھے۔ سعادت علی خاں اندر گئے اور کہا کہ بھائی صاحب بڑا غضب ہے آپ کی حکومت اور شہر

میں یہ قیامت! آصف الدولہ نے کہا کیوں بھئی خیر باشد انھوں نے کہا کہ مرزا رفیع جس کو باواجان نے برادرِ من اور مشفق مہربان کہہ کر خط لکھا۔ آرزوئیں کرکے بُلایا اور وہ نہ آیا۔ آج وہ یہاں موجود ہے اور اس حالت میں ہے کہ اگر اس وقت میں نہ پہنچتا تو شہر کے بدمعاشوں نے اس بے چارے کو بے حرمت کر ڈالا تھا پھر سارا ماجرا بیان کیا۔

آصف الدولہ فرشتہ خصال گھبرا کے بولے کہ بھئی مرزا فاخر نے ایسا کیا تو مرزا کو کیا گویا ہم کو بے عزت کیا۔ باواجان نے انہیں بھائی لکھا تو وہ ہمارے چچا ہوئے۔ سعادت علی خاں نے کہا کہ اس میں کیا شبہ ہے! اسی وقت باہر نکل آئے۔ سارا حال سُنا بہت غصّے ہوئے اور حکم دیا کہ شیخ زادوں کا محلّہ کا محلّہ اکھڑوا کر پھینک دو اور شہر سے نکلوا دو۔ مرزا فاخر کو جس حال میں ہو اُسی حال سے حاضر کرو۔ سودا کی نیک نیتی دیکھنی چاہیئے۔ ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ جنابِ عالی! ہم لوگوں کی لڑائی کاغذ قلم کے میدان میں آپ ہی فیصل ہو جاتی ہے۔ حضور اس میں مداخلت نہ فرماویں غلام کی بدنامی ہے۔ جتنی مدد حضور کے اقبال سے پہنچی وہی کافی ہے۔ غرض مرزا رفیع باعزاز واکرام وہاں سے رخصت ہوئے۔ نواب

نے احتیاطاً سپاہی ساتھ کر دیئے۔
حریفوں کو جب یہ راز کھلا تو امرائے دربار کے پاس دوڑے۔
صلاح ٹھیری کہ معاملہ روپیہ یا جاگیر کا نہیں۔ تم سب مرزا فاخر کو
ساتھ لے کر مرزا رفیع کے پاس چلے جاؤ اور خطا معاف کروالو
دوسرے دن آصف الدولہ نے سر دربار مرزا فاخر کو بھی بُلایا
اور کہا کہ تمہاری طرف سے بہت نازیبا حرکت ہوئی۔ اگر شعر
کے مرد میدان ہو تو آپ روبرو سودا کے ہجو کہو۔ مرزا فاخر نے کہا
ایں از ما نمی آید۔ آصف الدولہ نے بگڑ کر کہا۔ درست ایں از شما
نمے آید۔ ایں مے آید کہ شیاطین خود را بر سر میرزا ئے بے چارہ فرستادید
از خانہ بیازارش کشیدند و مے خواستند آبرویش بخاک ریزند۔
پھر سودا کی طرف اشارہ کیا۔ یہاں کیا دیر تھی فی البدیہ رباعی پڑھی ؎
تو فخر خراسانی و فا ساقط از و ٭ گوہر یداں داری و راسا قط از و
روزاں و شباں ز حق تعالیٰ خواہم ٭ مرکب وحدت خدا و یا ساقط از و
یہ جھگڑا تو رفع دفع ہوا مگر دُور دُور سے ہجوؤں میں چوٹیں چلتی رہیں
لطف یہ ہے کہ مرزا فاخر کی کہی ہوئی ہجویں کوئی جانتا بھی نہیں
سودا نے جو کچھ اُن کے حق میں کہا وہ ہزاروں کی زبان پر ہے۔
(۱۰۴) نقل۔ مولوی غلام ضامن صاحب رہتے کے فاضل تھے ایک

دن غزل لے کر گئے کہ مجھے شاگرد کیجئے۔ اور اس سے اصلاح فرمائیے
مرزا فاخر نے ٹال دیا۔ مولوی صاحب نے پھر کہا۔ انہوں نے پھر
انکار کیا۔ اور کج خلقی کرنے لگے۔ جو عجز و انکسار کے حق تھے سب
مولوی صاحب نے ادا کیے ایک نہ قبول ہوا ناچار یہ شعر پڑھکر
اُٹھ کھڑے ہوئے ؎

مرزا مکین ناشنود چوں بکین ما * کین است جزو اعظم مرزا مکین ما

۱۰۳) آصف الدولہ ایک دفعہ شکار کو گئے۔ خبر آئی کہ نواب
نے بھیلوں کے جنگل میں شیر مارا۔ باوجودیکہ ہمیشہ انعام و اکرام
کے انباروں سے زیر بار تھے مگر فوراً کہا ؎

یارو یہ ابن ملجم پیدا ہوا دوبارہ * شیر خدا کو جس نے بھیلوں کے بن میں مارا

نواب کو بھی خبر ہوئی جب پھر کر آئے تو خود شکایت دوستانہ
کے طور پر کہا کہ مرزا تم نے ہم کو شیر خدا کا قاتل بنایا؟ ہنس کر
کہا کہ جناب عالی شیر تو اللہ ہی کا تھا نہ حضور کا نہ فدوی کا۔

۱۰۴) لطیفہ۔ آصف الدولہ مرحوم کی انّا کی لڑکی خورد سال تھی۔
نواب فرشتہ سیرت کی طبیعت میں ایک تو عموماً تحمل اور بے پروائی
تھی۔ دوسرے اُس کی ماں کا دودھ پیا تھا۔ ناز برداری نے اس
کی شوخی کو شرارت کر دیا۔ ایک دن دوپہر کا وقت تھا۔ نواب

سوتے تھے۔ ایسا غل مچایا کہ یہ بدخواب ہوکر جاگ اُٹھے۔ بہت جھنجھلائے اور خفا ہوتے ہوئے باہر نکل آئے۔ سب ڈر گئے کہ آج نواب کو غصّہ آیا ہے خدا خیر کرے۔ باہر آکر حکم دیا کہ مرزا کو بلاؤ۔ مرزا اُسی وقت حاضر ہوئے۔ فرمایا کہ بھئی مرزا! اس لڑکی نے مجھے بڑا حیران کیا ہے تم اس کی ہجو کہہ دو۔ یہاں تو ہر وقت مصالح طیّار تھا۔ اُسی وقت قلم دوات لے کر بیٹھ گئے۔ اور مثنوی طیّار کر دی کہ ایک شعر اس کا لکھتا ہوں ؎

لڑکی وہ لڑکیوں میں جو کھیلے ٭ نہ کہ لونڈوں میں جاکے ڈنٹر پیلے

بعض بزرگوں سے یہ بھی سُنا ہے کہ دلّی میں نالہ پر ایک دکان میں بھٹیاری رہتی تھی۔ وہ آپ بھی لڑاکا تھی۔ مگر لڑکی اس سے بھی سوا چنچل ہوئی۔ آتے جاتے جب دیکھتے لڑتے ہی دیکھتے ایک دن کچھ خیال آگیا اس پر یہ ہجو کہی تھی۔

(۱۲۵) لطیفہ۔ شیخ قایم علی ساکن اٹاوہ ایک طبّاع شاعر تھے کمالِ اشتیاق سے مقبول نبی خاں، انعام اللہ خاں یقین کے بیٹے کے ساتھ بارادۂ شاگردی ان کے پاس آئے اور اپنے اشعار سُنائے آپ نے پوچھا تخلّص کیا ہے۔ کہا امیدوار مسکرائے اور فرمایا ؎

ہر فیض سے کسی کے شجر ان کا بار دار ٭ اس واسطے کیا ہے تخلّص امیدوار[1]

[1] جب عورت حاملہ ہوتی ہے تو ان کے محاورہ میں کہتے ہیں کہ امیدواری ہے یا اللہ کی درگاہ سے امید ہے۔ ۱۲

بے چارے شرمندہ ہو کر چلے گئے۔ قایم تخلّص اختیار کیا۔ اور کسی اور کے شاگرد ہوئے۔ ان کی طبیعت میں جو شوخیاں تھیں وہ حقیقت میں اتنی نہ تھیں جتنا انہیں لوگوں نے خطرناک بنا رکھا تھا بے شک جوان سے لڑتا تھا اُسے خوب خراب کرتے تھے۔ مگر اخلاق و انصاف سے خالی نہ تھے۔

(۱۰۶) **نقل**۔ راسخ عظیم آبادی کا دیوان میں نے دیکھا ہی۔ بہت سنجیدہ کلام ہی۔ پُرانے مشاق تھے اور سب ادھر کے لوگ انھیں اُستاد مانتے تھے۔ مرزا کے پاس شاگرد ہونے کو آئے۔ مرزا نے کہا کوئی شعر سُنائیے۔ انھوں نے پڑھا ؎

ہوئے ہیں ہم ضعیف اب دینی رونا ہمارا ہی ٭ پلک پر اپنی آنسو صبح پیری کا ستارا ہی

مرزا نے اُٹھ کر گلے لگا لیا۔

(۱۰۷) **لطیفہ**۔ ایک دن میاں ہدایت[1] ملاقات کو آئے بعد رسوم معمولی کے آپ نے پوچھا کہ فرمائیے میاں صاحب آج کل کیا شغل رہتا ہی۔ انھوں نے کہا افکارِ دُنیا فرصت نہیں دیتے۔ طبیعت کو ایک مرض یادہ گوئی کا لگا ہوا ہی۔ گاہے ماہے غزل کا اتفاق ہو جاتا ہی۔ مرزا ہنس کر بولے کہ غزل کا کہنا کیا! کوئی ہجو کہا کیجیے

[1] ایک مرد متین دیرینہ سال اس زمانے کے شعرائے معتبر میں سے تھے۔ خواجہ میر درد کے شاگرد تھے۔۱۲

بے چارے نے حیران ہو کر کہا کہ ہجو کس کی کہوں؟ آپ نے کہا کہ ہجو کو کیا چاہیئے۔ تم میری ہجو کہو۔ میں تمہاری ہجو کہوں۔

(۱۰۸) لطیفہ۔ ایک ولایتی نے کہ زمرۂ اہلِ سیف میں معززِ ملازم تھا عجب تماشا کیا۔ یعنی سودا نے اس کی ہجو کہی اور ایک محفل میں اس کے سامنے ہی پڑھنی شروع کر دی۔ ولایتی بیٹھا سنتا گیا۔ جب ہجو ختم ہوئی اٹھ کر سامنے آ بیٹھا۔ اور ان کی کمر پکڑ کر مسلسل و متواتر گالیوں کا جھاڑ باندھ دیا۔ انہیں بھی ایسا اتفاق آج تک نہ ہوا تھا۔ حیران ہو کر کہا کہ چہ باشد۔ خیر باشد۔ احباب آغا اقسامِ ایں مقالات شایانِ شانِ شما نیست۔ ولایتی نے پیش قبض کمر سے کھینچ کر ان کے پیٹ پر رکھ دی اور کہا نظم خودت گفتی۔ حالا ایں نثر را گوش کن۔ ہر چہ تو گفتی نظم بود نظم از ما نمے آید مایہ نثر ادا کردیم۔

(۱۰۹) لطیفہ۔ سید انشا کا عالمِ نوجوانی تھا۔ مشاعرے میں غزل پڑھی ؎

جھڑکی سہی ادا سہی چینِ جبیں سہی ٭ سب کچھ سہی پر ایک نہیں کی نہیں سہی

جب یہ شعر پڑھا کہ ؎

گر ناز نیں کہے سے برا مانتے ہو تم ٭ میری طرف تو دیکھیے میں نازنیں سہی

سودا کا عالم پیری تھا مشاعرے میں موجود تھے مسکرا کر بولے
دُریں چہ شک!

(۱۱۰) نقل۔ ایک دفعہ سودا مشاعرے میں بیٹھے تھے۔ لوگ اپنی اپنی
غزلیں پڑھ رہے تھے۔ ایک شریف زادے کی ۱۲-۱۳ برس کی
عمر۔ اُس نے غزل پڑھی مطلع تھا ؎

دل کے پھپھولے جل اُٹھے سینے کے داغ سے ٭ اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

گرمیٔ کلام پر سودا بھی چونک پڑے پوچھا یہ مطلع کس نے پڑھا؟
لوگوں نے کہا حضرت یہ صاحبزادہ ہیں۔ سودا نے بھی بہت تعریف
کی کئی مرتبہ پڑھوایا اور کہا کہ میاں لڑکے جوان تو ہوتے نظر
نہیں آتے۔ خدا کی قدرت اُنہیں دنوں میں لڑکا جل کر مر گیا۔

لطیفہ (۱۱۱) کہ فخر شعرائے ایران زمین شیخ علی حزیں وارد ہندوستان
ہوئے۔ پوچھا کہ شعرائے ہند میں آج کل کوئی صاحب کمال ہے؟
لوگوں نے سودا کا نام لیا اور سودا خود ملاقات کو گئے۔ شیخ
کی عالی دماغی اور نازک مزاجی شہرۂ آفاق ہے نام و نشان پوچھ
کر کہا کہ کچھ اپنا کلام سناؤ۔ سودا نے کہا ؎

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں ٭ تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

شیخ نے کہا کہ تڑپے چہ معنی دارد۔ سودا نے کہا کہ اہل ہند طپیدن

راثرپینا میگو بند شیخ نے پھر شعر پڑھوایا۔ اور زانو پر ہاتھ مار کر کہا
کہ مرزا رفیع قیامت کر دی یک مرغ قبلہ نما باقی بود آنرا ہم نگذاشتی
یہ کہہ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور بغل گیر ہو کر پاس بٹھایا۔ مگر بعض
اشخاص کی روایت ہے کہ شیخ نے کہا "دَر پوچ گویانِ ہند بد نیستی"
(۱۱۲) لطیفہ۔ خانِ آرزو کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا۔ سودا اِن
دنوں نوجوان تھے مطلع پڑھا ؎

آلودۂ قطراتِ عرق دیکھ جبیں کو ٭ اختر پڑے جھانکیں ہیں فلک پر سے زمیں کو

یا تو لاعلمی سے یا ان کی آتش زبانی کے ڈر سے کوئی نہ بولا مگر خانِ آرزو
جن کی دایۂ قابلیت کے دودھ سے مظہر، سودا، میر، درد وغیرہ
نوجوانوں نے پرورش پائی ہے انہوں نے فوراً یہ شعر پڑھا۔ کہ قدسی کے
مطلع پر اشارہ ہے۔ ؎

شعرِ سودا حدیثِ قدسی ہے ٭ چاہیئے لکھ رکھیں فلک پہ ملک

آلودۂ قطراتِ عرق دیدہ جبیں را ٭ اختر زفلک مے نگرد روئے زمیں را

سودا بے اختیار اُٹھ کھڑے ہوئے۔ خان صاحب کے گلے سے لپٹ
گئے اور اس شکریہ کے ساتھ خوشی ظاہر کی گویا حقیقتہً خان صاحب
نے ان کے کلام کو مثلِ حدیث قدسی تسلیم کیا ہے۔ اِن کا ایک
اَور شعر ایسا ہی ہے ؎

بہار بے سپر جام و یار گزرے ہے * نسیم تیر سی سینہ کے پار گزرے ہے

فارسی میں کوئی اُستاد کہتا ہے ؎

بہار بے سپر جام و یار مے گزرد * نسیم ہمچو خدنگ از کنار مے گزرد

مگر اہلِ تحقیق کا قول ہے کہ ایسی صورتِ خاص کو سرقہ نہیں۔ ترجمہ سمجھنا چاہیئے کیوں کہ شعر کو شعر ہی میں ترجمہ کرنا بھی ایک دشوار صنعت ہے۔ قطع نظر اس کے اسی مطلع کے بعد اور اشعار کو دیکھو کہ کیا موتی پروئے ہیں اور کلّیات ایک دریا ہے کہ اقسام جواہر سے بھرا ہوا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس رتبے کا شاعر ایک مطلع کا محتاج تھا اس لئے چُرا لیا۔

(۱۱۳) **نقل**۔ معتبر لوگوں سے سُنا ہوا ہے کہ کسی شخص نے سودا سے پوچھا بلبل مُذکّر ہے یا مؤنّث۔ مُسکرا کر بولے کہ نوعِ انسان میں ایک ہو تو مرد سے عورت ہو جاتی ہے۔ لفظ کو دیکھو دو موجود ہیں[1]

(۱۱۴) جب مرزا رفیع لڑکے تھے۔ اُس وقت میر جعفر زٹلی کا بُڑھاپا تھا۔ اگلے وقتوں کے لوگ رنگین جریبیں جن پر نقاشی کا کام ہوتا تھا اکثر ہاتھ میں رکھا کرتے تھے۔ ایک دن شام کے قریب میر موصوف ایک سبز رنگ جریب ٹیکتے۔ ٹہلنے کو باہر نکلے۔

---

[1] اب تو بُلبل تانیث ہو گئی۔ اب بھی نہ مؤنث ہو گی۔ ۱۲

مرزا بغل میں کتابوں کا جزدان لیے سامنے سے آتے تھے
اس زمانے میں ادب کی بڑی پابندی تھی۔ بزرگوں کو سلام کرنا
اور ان کی زبان سے دعا لینے کو بڑی نعمت سمجھتے تھے۔ مرزا
نے جھک کر سلام کیا انہوں نے خوش ہو کر دعا دی۔ چوں کہ
بچپن ہی میں مرزا کی موزونیِ طبع کا چرچا تھا۔ میر صاحب کچھ
باتیں کرنے لگے۔ مرزا ساتھ ہو لیے۔ انہوں نے تو خیر طبیعت
کے بڑھانے کے لیے کہا کہ مرزا بھلا ایک مصرع پر مصرع تو
لگاؤ۔ ع۔ لالہ در باغ داغ چوں دارد؟
مرزا نے سوچ کر کہا ع۔ عمر کوتاست غم فزوں دارد
میر صاحب نے فرمایا واہ مرزا دن بھر کے بھوکے تھے ۵ کھا گئے۔
مرزا نے پھر کہا۔ ع۔ از غم عشق سینہ خوں دارد
میر صاحب نے فرمایا۔ واہ بھئی دل خون ہوتا ہے۔ جگر خون ہوتا
ہے بھلا سینہ کیا خون ہوگا؟ سینہ پُرخوں ہوتا ہے۔
مرزا نے پھر ذرا فکر کیا اور کہا ع چہ کند سوزشِ دروں دارد
میر صاحب نے کہا کہ ہاں مصرع تو ٹھیک ہے لیکن ذرا طبیعت
پر زور دے کر کہو۔
مرزا دق ہو گئے تھے۔ جھٹ کہہ دیا ع یک عصا سر نہ ۔۔۔۔ دارد

میر جعفر مرحوم ہنس پڑے اور جریب اُٹھا کر کہا۔ کیوں! یہ ہم سے بھی دیکھ کہوں گا تیرے باپ سے بازی یازی برلش یا باہم بازی۔ مرزا لڑکے تو تھے ہی۔ بھاگ گئے۔

(۱۱۵) مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب کا گھرانا اور یہ خاندان ایک محلہ میں رہتے تھے۔ ان کے والدِ مرحوم کے زمانہ میں شاہ صاحب عالمِ طفولیت میں تھے ایک دن اُس جلسے میں چلے گئے اور خواجہ[۱] صاحب

---

[۱] خواجہ میر نام درد تخلص۔ خواجہ محمد ناصر عندلیب آپ کے والد ماجد تھے۔ خاندان ان کا دلّی میں باعثِ پیری مریدی کے نہایت معزز و معظّم تھا۔ آپ بڑے صاحبِ تصوف تھے اور فنِ موسیقی میں آپ کو بڑا کمال تھا۔ موسیقی دل کو فرحت اور روح کو عروج دیتا ہے۔ اس واسطے اہلِ تصوف کے اکثر فرقوں نے اسے عبادت میں شامل کیا ہے چنانچہ معمول تھا کہ ہر مہینے کی دوسری اور چوبیس کو شہر کے بڑے بڑے کلاونت، ڈوم، گویئے۔ قوّال، صاحبِ کمال جمع ہوتے تھے اور معرفت کی چیزیں گاتے تھے۔ آپ کی بارہ دری حیلوں کے کوچے اب تک موجود ہے اور آپ کی اولاد بھی موجود ہے۔ چنانچہ حکیم ناصر نذیر صاحب بڑے متقّی پرہیز گار اور شاعر بے نظیر اب ہیں۔ خواجہ صاحب کا وصال اڑسٹھ برس کی عمر میں ۲۴ صفر یوم جمعہ سنہ ۱۱۹۹ھ میں دہلی میں ہوا۔ کسی مرید با اعتقاد نے تاریخ کہی ہے۔

رع۔ حیف دُنیا سے سدھارا وہ خدا کا محبوب!

کے پاس جا بیٹھے۔ اُن کی مرید بہت سی کنچنیاں بھی تھیں۔ اور چوں کہ اس وقت رخصت ہوا چاہتی تھیں۔ اس لیے سب سامنے حاضر تھیں باوجودیکہ مولوی صاحب اس وقت بچّہ تھے مگر اُن کا تبسّم اور طرزِ نظر دیکھ کر خواجہ صاحب اعتراض کو پا گئے۔ اور کہا کہ فقیر کے نزدیک تو یہ سب ماں بہنیں ہیں۔ مولوی صاحب نے کہا کہ ماں بہنوں کو عوام الناس بیں لے کر بیٹھنا کیا مناسب ہے خواجہ صاحب خاموش ہو رہے۔

ان کے ہاں ایک صحبت خاص ہوتی تھی۔ اس میں خواجہ میر درد صاحب نالۂ عندلیب یعنی اپنے والد کی تصنیفات اور اپنے کلام کچھ کچھ بیان کرتے تھے ایک دن مرزا رفیع سے سرِ راہ ملاقات ہوئی خواجہ صاحب نے تشریف لانے کے لیے فرمائش کی۔ مرزا نے کہا صاحب مجھے یہ نہیں بھاتا کہ سو کوّے کائیں کائیں کریں اور بیچ میں ایک بیدا بیٹھ چوں چوں کرے۔ اس زمانے کے بزرگ ایسے صاحب کمالوں کی بات کا تحمّل اور برداشت کرنا لازمہ بزرگی سمجھتے تھے۔ آپ مسکرا کے چپکے ہو رہے۔

(۱۷) نقل۔ ایک شخص لکھنؤ سے دلّی چلے۔ مرزا رفیع کے پاس گئے اور کہا کہ دلّی جاتا ہوں کسی یار آشنا کو کچھ کہنا ہو تو کہہ دیجیے مرزا بولے کہ بھائی میرا دلّی میں کون ہے۔ ہاں خواجہ میر درد کی طرف

جا نکلو تو سلام کہہ دینا۔

ذرا خیال کرکے دیکھو مرزا رفیع جیسے شخص کو دلّی بھر میں (اور دلّی بھی اُس زمانے کی دلّی) کوئی آدمی معلوم نہ ہوا۔ اللہ وہ کیا کیا جواہر تھے اور کیا کیا جوہری۔ سبحان اللہ اُستادِ مرحوم نے کیا کیا موتی پروتے ہیں ؎

دکھلائے ہم نے آنکھ سے لے کر جو دُرِ اشک ٭ قائل ہماری آنکھ کے سب جوہری ہوئے

(۱۱۸) خواجہ صاحب کا ایک شعر ہے۔ لطیفہ

بیگانہ گر نظر پڑے تو آشنا کو دیکھ ٭ بندہ گر آئے سامنے تو بھی خدا کو دیکھ

اسی مضمون کا شعر فارسی کا ہے ؎

بسکہ در چشم و دلم ہر لحظہ اے یارم توئی ٭ ہر کہ آید در نظر از دُور پندارم توئی

جب یہ شعر شاعر نے جلسہ میں پڑھا تو مُلّا شیدا ایک شوخ طبع۔ دہن دریدہ شاعر تھے۔ انہوں نے کہا کہ اگر سگ در نظر آید۔ شاعر نے کہا پندارم توئی۔ مگر انصاف شرط ہے۔ خواجہ صاحب نے اپنے شعر میں اس پہلو کو خوب بچایا ہے۔ رباعی

اے درد یہ دردِ جی کا کھونا معلوم ٭ جوں لالہ جگر سے داغ دھونا معلوم

گلزارِ جہاں ہزار پھولے لیکن ٭ میرے دل کا شگفتہ ہونا معلوم

(۱۱۹) شاہ حاتم کی رباعی بھی اسی مضمون میں لاجواب ہے۔ رباعی

ان سیم بروں کے ساتھ سونا معلوم ٭ قسمت میں لکھی ہی خاک سونا معلوم
حاتم افسوس دی و امروز گزشت ٭ فردا کی رہی امید سونا معلوم

(۱۳۰) **نقل**۔ ایک دن سوداؔ کے ہاں میر سوزؔ[1] تشریف لائے۔ ان دنوں میں شیخ علی حزیں کی غزل کا چرچا تھا جس کا مطلع یہ ہے ؎

میگر فتیم بجا نا سر راہے گاہے ٭ او ہم از لطف نہاں داشت نگاہے گاہے

میر سوز مرحوم نے اپنا مطلع پڑھا ؎

نہیں نکلے ہے مرے دل کی اُبال ہے گاہے ٭ اے فلک بہر خدا رخصت آہے گاہے

مرزا سُن کر بولے کہ میر صاحب بچپن میں ہمارے ہاں پشور

[1] سوز، تخلّص محمد میر نام دلّی کے قرادل پورے میں رہتے تھے (اب یہ محلّہ نہیں رہا) مگر اصل وطن ان کے بزرگوں کا بخارا تھا۔ باپ ان کے سید ضیاء الدین بہت بزرگ تھے شاہ عالم کے زمانے میں جب اہلِ دہلی کی تباہی حد سے گزر گئی تو سنہ ۱۱۹۹ھ میں لباسِ فقیری اختیار کیا اور لکھنؤ چلے گئے۔ مگر وہاں سے سنہ ۱۲۱۲ھ میں ناکام مرشدآباد گئے یہاں بھی نصیبے نے یاوری نہ کی پھر لکھنؤ آئے اب قسمت رجوع ہوئی اور نواب آصف الدولہ ان کے شاگرد ہوئے۔ چند روز آرام سے نہ گزرے تھے کہ خود گزر گئے۔ پہلے میرؔ تخلّص کرتے تھے۔ جب میر تقی مرحوم میرؔ کے تخلّص سے عالم گیر ہوئے تو انہوں نے سوزؔ اختیار کیا چنانچہ ایک شعر میں دونوں تخلّصوں کا اشارہ کرتے ہیں ؎

کہتے تھے پہلے میرؔ میرؔ تب ہوئے تھے ہم ادیب ٭ اب جو کہے ہیں سوزؔ سوزؔ یعنی سدا جلا کرو

کی ڈومنیاں آیا کرتی تھیں۔ یا تو جب یہ لفظ سُنا تھا یا آج سُنا
میر سوز بے چارے ہنس کر چپکے ہو رہے۔ پھر مرزا نے خود اسی
وقت مطلع کہہ کر پڑھا ؎

نہیں جوں گل ہوس ابریسیاہ ہے گا ٭ کاہ ہوں خشک میں لے برق نگاہ ہے گا

(۱۲۱) میاں **جرأت** کی ان دنوں میں ابتدا تھی خود جرأت نہ
کرسکے۔ ایک اور شخص نے کہا کہ حضرت! یہ بھی کچھ عرض کیا چاہتے
ہیں۔ مرزا نے کہا کیوں بھئی کیا؟ جرأت نے پڑھا ؎

سرسری ان سے ملاقات ہی ہے گا ٭ صحبتِ غیر میں گاہے سرِ راہے گا ہے

سب نے تعریف کی اور مرزا ے موصوف نے بھی تحسین و آفریں کے
ساتھ پسند کیا اسی پر ایک اور مطلع یاد ہی چاہو ظفر کا کہہ چا ہو نہ
ذوق کا سمجھو ؎

اس طرف بھی تمہیں لازم ہی نگاہے گاہے ٭ دمبدم لحظہ بہ لحظہ نہیں گاہے گاہے

(۱۲۲) **نقل** کسی شخص نے سوز سے آکر کہا کہ حضرت! ایک شخص آپ
کے تخلص پر آج ہنستے تھے اور کہتے تھے کہ سوز گوز کیا تخلص رکھا ہے
ہمیں پسند نہیں۔ انہوں نے کہنے والے کا نام پوچھا۔ اس نے بعد
بہت انکار اور اصرار کے بتایا۔ معلوم ہوا کہ شخصِ موصوف بھی مشاعرے
میں ہمیشہ آتے ہیں **میر سوز** مرحوم نے کہا خیر کچھ مضائقہ نہیں اب کے

صحبتِ مشاعرے میں تم مجھ سے برسرِ جلسہ یہی سوال کرنا۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اور بآوازِ بلند پوچھا حضرت آپ کا تخلّص کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ صاحب قبلہ فقیر نے تخلّص تو میرؔ کیا تھا مگر وہ میر تقیؔ صاحب نے پسند فرمایا۔ فقیر نے خیال کیا کہ ان کے کمال کے سامنے میرا نام نہ روشن ہو سکے گا۔ ناچار سوزؔ تخلّص کیا (شخص مذکور کی طرف اشارہ کر کے کہا) سُنتا ہوں یہ صاحب گوز کرتے ہیں۔ مشاعرے میں عجیب قہقہہ اُڑا۔ لکھنؤ میں ہزاروں آدمی مشاعرے میں جمع ہوتے تھے۔ سب کے کان تک آوازہ گئی تھی کئی کئی دفعہ ہوا کر سُنا اِدھر شخصِ موصوف اُدھر میر تقیؔ صاحب دونوں چُپ بیٹھے سُنا کیے۔

(۱۴۲) ایک دن نوابِ مرحوم نے ایک غزل کی فرمائش کی۔ دوسرے تیسرے دن جو پھر گئے تو پوچھا کہ میر صاحب[1]! ہماری غزل لائے میر صاحب نے تیوری بدل کر کہا۔ جنابِ عالی! مضمون غلام کی جیب میں تو بھرے ہی نہیں کہ کل آپ نے فرمائش کی آج غزل حاضر کر دے۔ اُس فرشتہ خصال نے کہا۔ خیر میر صاحب جب

---

[1] میر تخلّص محمد تقی نام سنہ ۱۱۹۰ھ میں دلّی چھوڑ کے لکھنؤ گئے نواب آصف الدولہ بہادر نے دو سو روپیہ مہینا کر دیا ۱۲

طبیعت حاضر ہوگی کہہ دیجیئے گا۔

(۱۲۴) ایک دن نواب نے بلا بھیجا۔ جب پہنچے تو دیکھا کہ نواب حوض کے کنارے کھڑے ہیں۔ ہاتھ میں چھڑی ہے۔ پانی میں لال سبز مچھلیاں تیرتی پھرتی ہیں۔ آپ تماشا دیکھ رہے ہیں۔ میر صاحب کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ میر صاحب کچھ فرمائیے۔ میر صاحب نے غزل سنانی شروع کی۔ نواب سنتے جاتے تھے۔ اور چھڑی کے ساتھ مچھلیوں سے بھی کھیلتے جاتے تھے۔ میر صاحب چیں بجبیں ہوتے اور ہر شعر پر ٹھیر جاتے تھے۔ نواب کہے جاتے تھے کہ ہاں پڑھیئے۔ آخر چار شعر پڑھ کر میر صاحب ٹھیر گئے اور بولے کہ پڑھوں کیا آپ تو مچھلیوں سے کھیلتے ہیں۔ متوجہ ہوں تو پڑھوں۔ نواب نے کہا جو شعر ہوگا آپ متوجہ کرے گا۔ میر صاحب کو یہ بات زیادہ ناگوار گذری غزل جیب میں ڈال گھر کو چلے آئے اور پھر جانا چھوڑ دیا۔ چند روز کے بعد ایک دن بازار میں چلے جاتے تھے۔ نواب کی سواری سامنے سے آگئی۔ دیکھتے ہی نہایت محبت سے بولے کہ میر صاحب آپ نے بالکل ہمیں چھوڑ دیا۔ کبھی تشریف بھی نہیں لاتے۔ میر صاحب نے کہا بازار میں باتیں کرنا آداب شرفا نہیں یہ کیا گفتگو کا موقع ہے غرض

بدستور اپنے گھر بیٹھے رہے۔ اور فقر و فاقہ میں گزارہ کرتے رہے
آخر ۱۲۲۵ھ میں فوت ہوئے۔ اور سو برس کی عمر پائی۔ ناسخ
نے تاریخ کہی کہ ع "واویلا مُرد شہِ شاعراں"

(۱۲۵) **میر قمر الدین منّت**[1]۔ دلّی میں ایک شاعر گزرے ہیں
کہ علوم رسمی کی قابلیت سے عمایدِ دربار شاہی میں تھے وہ میر صاحب
کے زمانے میں مبتدی تھے۔ شعر کا شوق بہت تھا۔ اصلاح کے
لیئے اُردو کی غزل لے گئے۔ میر صاحب نے وطن پوچھا انہوں نے
سونی پت علاقہ پانی پت بتلایا آپ نے فرمایا کہ سید صاحب
اردوئے معلّیٰ خاص دلّی کی زبان ہے۔ آپ اس میں تکلیف نہ کیجیے اپنی
فارسی وارسی کہہ لیا کیجیے۔

(۱۲۶) سعادت یار خاں رنگین نواب طہماسپ بیگ خاں قلعدار
شاہی کے بیٹے تھے ۱۴۔۱۵ برس کی عمر تھی بڑی شان و شوکت
سے گئے۔ اور غزل اصلاح کے لیئے پیش کی سُن کر کہا کہ صاحب
زادے آپ خود امیر ہیں اور امیر زادے ہیں۔ نیزہ بازی۔
تیر اندازی کی کثرت کیجیے۔ شہسواری کی مشق فرمایئے۔ شاعری
دل خراشی و جگر سوزی کا کام ہے آپ اس کے درپے نہ ہوں جب
انہوں نے بہت اصرار کیا تو فرمایا تو آپ کی طبیعت اس فن کے

[1] میر نظام الدین ممنون ان کے بیٹے بڑے صاحب کمال اور نامور شاعر تھے۔

مناسبت نہیں۔ یہ آپ کو نہیں آنے کا۔ خواہ مخواہ میری اور اپنی
اوقات ضائع کرنی کیا ضرور ہے۔ یہی معاملہ شیخ ناسخ کے ساتھ گزرا

(۱۲۷) دلّی میں میر صاحب نے ایک مثنوی کہی۔ اپنے تئیں اژدہا
قرار دیا۔ اور شعرائے عصر میں سے کسی کو چوہا، کسی کو سانپ، کسی
کو بچھّو، کسی کو کنکھجورا۔ وغیرہ وغیرہ ٹھیرایا۔ ساتھ اس کے ایک
حکایت لکھی کہ دامنِ کوہ میں ایک خونخوار اژدہا رہتا تھا۔ جنگل
کے حشرات الارض جمع ہو کر اس سے لڑنے گئے۔ جب سامنا
ہوا تو اژدہے نے ایک ایسا دم بھرا کہ سب فنا ہو گئے۔ اس
قصیدے کا نام اجگر نامہ قرار دیا۔ اور مشاعرے میں لا کر پڑھا۔
محمد امان نثار[۱]۔ شاہ حاتم کے شاگردوں میں ایک مشاق موزوں

[۱] سعادت اللہ معمار کے بیٹے تھے اور میاں استا معمار کی اولاد میں تھے جنہوں
نے دہلی کی جامع مسجد بنوائی تھی۔ نثار کے بزرگ اور وہ خود عمارت میں کمال رکھتے تھے
نثار شعر بھی خوب کہتے تھے۔ چنانچہ زمین سخن میں ریختہ کا دیوان ضخیم یادگار چھوڑا ہے دلّی
آباد تھی تو امرائے شہر کے مکانات اپنے کمال سے مضبوط کرتے تھے۔ اور عزّت سے گزران
کرتے تھے۔ دلّی تباہ ہوئی تو یہ بھی لکھنؤ چلے گئے وہاں بھی فنِ آبائی سے عزّت پائی اور
ہمیشہ امرا اور رؤسا کی مصاحبت میں زندگی بسر کی۔ شاہ حاتم کے نامی شاگردوں میں تھے
میاں رنگین نے بھی مجالسِ رنگین میں ان کا ذکر کیا ہے۔ صاحبِ دیوان ہیں مگر اب دیوان
کم یاب ہے۔ میر صاحب کی اور ان کی اکثر چھیڑ چھاڑ رہتی تھی۔ ۱۲

طبع تھے انھوں نے وہیں ایک گوشے میں بیٹھ کر چند شعر کا قطعہ لکھا اور اُسی وقت سرِ مشاعرہ پڑھا چوں کہ میر صاحب کی یہ بات کسی کو پسند نہ آتی تھی۔ اس لیئے اس قطعہ پر خوب قہقہے اُڑے اور بڑی واہ واہ ہوئی اور میر صاحب پر جو گزرتی تھی سو گزری۔ چنانچہ مقطع قطعہ مذکور یہ ہے؎

حیدرِ کرّار نے وہ زور بخشا ہے نثار ✻ ایک دم میں دو کروں اژدر کے کلّے چیر کر

(۱۲۸) لکھنؤ میں کسی نے پوچھا کہ کیوں حضرت آج کل شاعر کون کون ہے؟ کہا ایک تو سودا۔ دوسرا یہ خاکسار ہے۔ اور کچھ تامل کر کے کہا آدھے خواجہ میر درد۔ کوئی شخص بولا کہ حضرت! اور میر سوز صاحب؟ چیں بجبیں ہو کر کہا کہ میر سوز صاحب بھی شاعر ہیں؟ انھوں نے کہا کہ آخر استاد نواب آصف الدولہ کے ہیں۔ کہا کہ خیر یہ ہے تو پونے تین سہی۔ مگر شرفا میں ایسے تخلّص ہم نے کبھی نہیں سُنے۔ میر صاحب کے سامنے مجال کس کی تھی جو کہے کہ۔ ان بے چارے نے میر تخلّص کیا تھا۔ وہ آپ نے چھین لیا۔ ناچار اب انھوں نے ایسا تخلّص اختیار کیا کہ نہ آپ کو پسند آئے نہ آپ اُسے چھینیں۔

(۱۲۹) لکھنؤ کے چند عمائد و ارکین جمع ہو کر ایک دن آئے کہ میر صاحب سے ملاقات کریں اور اشعار سُنیں۔ دروازہ پر آ کر آواز دی۔ لونڈی

یا ماما نکلی۔ حال پوچھ کر اندر گئی ایک بوریا لاکر ڈیوڑھی میں بچھایا انہیں بٹھایا۔ اور ایک پرانا حقّہ تازہ کرکے سامنے رکھ گئی۔ میر صاحب اندر سے تشریف لائے۔ مزاج پرسی وغیرہ کے بعد اُنہوں نے فرمائش اشعار کی۔ میر صاحب نے اول کچھ ٹالا۔ پھر صاف جواب دیا کہ صاحب قبلہ میرے اشعار آپ کی سمجھ میں نہیں آنے کے اگرچہ ناگوار ہوا مگر۔ بہ نظرِ آداب و اخلاق انہوں نے اپنی نارسائی طبع کا اقرار کیا۔ اور پھر درخواست کی۔ اُنہوں نے پھر انکار کیا آخر اُن لوگوں نے گراں خاطر ہو کر کہا کہ حضرت! **انوری و خاقانی** کا کلام سمجھتے ہیں۔ آپ کا ارشاد کیوں نہ سمجھیں گے میر صاحب نے کہا کہ درست ہے مگر اُن کی شرحیں مصطلحات اور فرہنگیں موجود ہیں۔ اور میرے کلام کے لیئے فقط محاورہ اہلِ اُردو ہے یا جامع مسجد کی سیڑھیاں اور اس سے آپ محروم۔ یہ کہہ کر ایک شعر پڑھا ؎

عشق برے ہی خیال پڑا ہے چین گیا آرام گیا
دل کا جانا ٹھیر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا

اور کہا آپ بموجب اپنی کتابوں کے کہیں گے کہ خیال کی یے کو ظاہر کرو۔ پھر کہیں گے کہ یے تقطیع میں گرتی ہے مگر یہاں اس کے سوا جواب نہیں کہ محاورہ یہی ہے

(۱۳۰) جب نواب آصف الدولہ مر گئے **سعادت علی خاں** کا دور ہوا تو یہ دربار جانا چھوڑ چکے تھے۔ وہاں کسی نے طلب نہ کیا ایک دن نواب کی سواری جاتی تھی۔ یہ **تحسین** کی مسجد پر سر راہ بیٹھے تھے۔ سواری سامنے آئی سب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میر صاحب اُسی طرح بیٹھے تھے **سید انشا** خواصی میں تھے۔ نواب نے پوچھا کہ **انشا** یہ کون شخص ہے؟ جس کی تمکنت نے اُسے اُٹھنے بھی نہ دیا عرض کی۔ جنابِ عالی یہ وہی گدائے متکبر جس کا ذکر حضور میں اکثر آیا ہے۔ گزارے کا وہ حال اور مزاج کا یہ عالم۔ آج بھی فاقہ ہی سے ہوگا۔ **سعادت علی خاں** نے آکر خلعتِ بحالی اور ایک ہزار روپیہ دعوت کا بھجوایا۔ جب چوبدار لے کر گیا۔ میر صاحب نے واپس کر دیا اور کہا کہ مسجد میں بھجوا دیجئے یہ گنہگار اتنا محتاج نہیں۔ سعادت علی خاں جواب سُن کر متعجب ہوئے۔ مصاحبوں نے پھر سمجھایا غرض نواب کے حکم سے سید انشا خلعت لے کر گئے اور اپنی طرز پر سمجھایا کہ نہ اپنے حال پر! بلکہ عیال پر رحم کیجئے۔ اور بادشاہِ وقت کا ہدیہ ہے۔ اسے قبول فرمائیے۔ میر صاحب نے کہا کہ صاحب! وہ اپنے ملک کے بادشاہ ہیں میں اپنے ملک کا بادشاہ ہوں۔ کوئی ناواقف اس طرح پیش آتا تو مجھے شکایت نہ تھی۔ وہ مجھ سے

واقف میرے حال سے واقف۔ اس پر اتنے دنوں کے بعد ایک
دس روپیے کے خدمت گار کے ہاتھ خلعت بھیجا۔ مجھے اپنا فقر و
فاقہ قبول ہے مگر یہ ذلّت نہیں اُٹھائی جاتی۔ سیّد انشا کی لسّانی اور
لفّاظی کے سامنے کس کی بات پیش جا سکتی۔ میر صاحب نے قبول
فرمایا۔ اور دربار میں بھی کبھی کبھی جانے لگے۔ نواب سعادت علی خاں
مرحوم اُن کی ایسی خاطر کرتے تھے کہ اپنے سامنے بیٹھنے کی اجازت
دیتے تھے۔ اور اپنا پیچوان پینے کو عنایت فرماتے تھے۔

(۱۳۱) میر صاحب کو بہت تکلیف میں دیکھ کر لکھنؤ کے ایک نواب
انہیں مع عیال اپنے گھر لے گئے اور محل سرا کے پاس ایک معقول
مکان رہنے کو دیا۔ نشست کے مکان میں کھڑکیاں باغ کی
طرف تھیں۔ مطلب اس سے یہی تھا کہ ہر طرح اُن کی طبیعت خوش
اور شگفتہ رہے۔ یہ جس دن وہاں آ کر رہے کھڑکیاں بند پڑی
تھیں۔ کئی برس گزر گئے اُسی طرح بند پڑی رہیں۔ کبھی کھول کر باغ
کی طرف نہ دیکھا۔ ایک دن کوئی دوست آئے اُنھوں نے کہا کہ
اِدھر باغ ہے آپ کھڑکیاں کھول کر کیوں نہیں بیٹھتے؟ میر صاحب
بولے کہ کیا ادھر باغ بھی ہے؟ انھوں نے کہا کہ اسی لیے نواب
آپ کو یہاں لائے ہیں کہ جی بہلتا رہے۔ اور دل شگفتہ ہو۔ میر صاحب

کے پھٹے پرانے مسودے غزلوں کے پڑے تھے اُن کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ میں تو اس باغ کی فکر میں ایسا لگا ہوا ہوں کہ اس باغ کی خبر بھی نہیں۔ یہ کہہ کر چپکے ہو رہے۔

کیا محویت ہے! کئی برس گزر جائیں۔ پہلو میں باغ ہو۔ اور کھڑکی تک نہ کھولیں۔ خیر۔ ثمرہ اس کا یہ ہوا کہ اُنھوں نے دُنیا کے باغ کی طرف نہ دیکھا۔ خدا نے اُن کے کلام کو وہ بہار دی کہ سالہا سال گزر گئے آج تک لوگ ورقے الٹتے ہیں اور گلزار سے زیادہ خوش ہوتے ہیں۔

(۱۳۲) ذوقِ مرحوم ایک دیرینہ سال شخص کی زبانی بیان کرتے تھے۔ کہ ایک دن میر صاحب کے پاس گئے۔ نکلتے جاڑے تھے بہار کی آمد تھی۔ دیکھا کہ ٹہل رہے ہیں۔ چہرہ پر افسردگی کا عالم ہے۔ اور رہ رہ کر یہ مصرع پڑھتے ہیں ع

اب کے بھی دن بہار کے یوں ہی گزر گئے

یہ سلام کرکے بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد اُٹھے اور سلام کرکے چلے آئے۔ میر صاحب کو خبر بھی نہ ہوئی۔ خدا جانے دوسرے مصرع کی فکر میں تھے۔ یا اسی مصرع کی کیفیت میں محو تھے۔

(۱۳۳) گورنر جنرل اور اکثر صاحبانِ عالی شان جب لکھنؤ میں جاتے

تو اپنی قدر دانی سے یا اس سبب سے کہ ان کے میر منشی اپنے علو حوصلہ
سے ایک صاحب کمال کی تقریب واجب سمجھتے تھے۔ میر صاحب
کو ملاقات کے لیے بلاتے۔ مگر یہ پہلو تہی کرتے اور کہتے کہ مجھ سے
جو کوئی ملتا ہے تو یا مجھ فقیر کے خاندان کے خیال سے یا میرے
کلام کے سبب سے ملتا ہے۔ صاحب کو خاندان سے غرض نہیں میرا
کلام سمجھتے نہیں۔ البتہ کچھ انعام دیں گے۔ ایسی ملاقات سے
ذلت کے سوا کیا حاصل۔

(۱۳۴) محلہ کے بازار میں عطار کی دکان تھی۔ آپ بھی کبھی کبھی اس دکان
پر جا بیٹھتے تھے۔ اُس کا نوجوان لڑکا بہت بناؤ سنگار کرتا رہتا تھا
میر صاحب کو برا معلوم ہوتا تھا۔ اس پر فرماتے ہیں ؎

کیفیتیں عطار کے لونڈے میں بہت ہیں ✲ اس نسخہ کی کوئی نہ رہی ہم کو دوا یاد

کسی وقت طبیعت شگفتہ ہو گئی ہو گی جو فرماتے ہیں ؎

میر کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب ✲ اسی عطار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں

(۱۳۵) اسی عہد میں بقاء اللہ خاں بقا نے دو شعر کہے ؎

ان آنکھوں کا نت گریہ دستور ہے ✲ دو آبہ جہاں میں یہ مشہور ہے
سیلاب سے آنکھوں کے رہتے ہیں خرابے میں ✲ ٹکڑے جو مرے دل کے بستے ہیں دو آبے میں

میر صاحب نے خدا جانے سن کر کہا یا توارد ہوا ؎

دے دن گئے کہ آنکھیں دریاسی بہتیاں تھیں * سوکھا پڑا ہی اب تو مدت سے یہ دوآبہ
اس پر بقانے بگڑکر یہ قطعہ کہا ؎
میر نے گر ترا مضمون دوآبے کا لیا * اے بقا تو بھی دعا دے جو دعا دینی ہی
یا خدا میر کی آنکھوں کو دوآبہ کر دے * اور بینی کا یہ عالم ہو کہ ترینی ہو
لیکن میر صاحب نے اسی کوچے میں ایک مضمون اور نکالا ہی کہ
وہ سب سے الگ ہی ؎
ہیں راہ عشق میں تو آگے ہی دو دِلا تھا * پر بیچ میں آپا قسمت سے یہ دوراہا
بقا نے اور مضامین بھی میر صاحب کے باب میں صرف کیے
ہیں ان میں سے ایک قطعہ ہی ؎
میر صاحب پھر اس سے کیا بہتر * اس میں ہووے جو نام شاعر کا
لے کے دیوان پھاڑے پھرتے * ہر گلی کوچہ کام شاعر کا
توبہ زاہد کی توبہ تلی ہی * چلئے بیٹھے تو شیخ چلی ہی
پگڑی اپنی سنبھالیے گا میر * اور بستی نہیں یہ دلّی ہی
(۱۳۶) بزرگوں کا قول ہی کہ شرافت و نجابت غریبی پر
عاشق ہی۔ دولت اور نجابت آپس میں سوکن ہیں یہ حق ہی
اور سبب اس کا یہ ہی کہ شرافت کے اصول و آئین غریبوں
ہی سے خوب نبھتے ہیں۔ امارت آئی قیامت آئی۔ دولت آئی

شامت آئی۔ میاں جرأت[1] کی خوش مزاجی۔ لطیفہ گوئی۔ مسخراپن کی حد سے گزری ہوئی تھی اور ہندوستان کے امیروں کو تو اس سے ضروری کوئی کام نہ اس سے زیادہ کوئی نعمت ہی کہتے ہیں مرزا قتیل سید انشا کا اور ان کا یہ حال تھا کہ گھر میں رہنے نہ پاتے تھے۔ آج ایک امیر کے ہاں ہیں۔ دوسرے دن دوسرے امیر آئے سوار کیا اور ساتھ لے گئے ۴۔۵ دن وہاں رہے۔ کوئی اور نواب آئے وہاں سے وہ لے گئے جہاں جائیں آرام و آسائش سے زیادہ عیش کے سامان موجود۔ رات دن قہقہے اور چہچہے۔ ایک بیگم صاحب نے گھر میں ان کے چٹکلے اور نقلیں سنیں۔ بہت خوش

---

[1] جرأت تخلص، قلندر بخش نام۔ اصلی نام یحیٰی امان تھا، اکبر آبادی مشہور ہیں مگر باپ ان کے حافظ امان خاص دلی کے رہنے والے تھے۔ چاندنی چوک دلی میں رائے مان کا کوچہ انہیں کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۲۱۵ھ میں لکھنؤ پہنچے اور مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں ملازم ہوئے عین جوانی میں چیچک کے صدمے سے نابینا ہو گئے۔ ۱۲۲۵ھ میں فوت ہوئے شیخ ناسخ نے تاریخ کہی۔ ؎

جب میاں جرأت کا باغ دہر سے ٭ گلشنِ فردوس کو جانا ہوا
مصرعِ تاریخ ناسخ نے کہا ٭ ہائے ہندوستان کا شاعر موا

۱۲۲۵ھ

ہوئیں اور نواب صاحب سے کہا کہ ہم بھی باتیں سُنیں گے۔ گھر میں لاکر کھانا کھلاؤ۔ پردے یا چلمنیں چھٹ گئیں اندر وہ بیٹھیں باہر یہ بیٹھے۔ چند روز کے بعد خاص خاص بیبیوں کا برائے نام پردہ رہا۔ باقی گھر والے سامنے پھرنے لگے۔ رفتہ رفتہ یگانگی کی یہ نوبت ہوئی کہ آپ بھی باتیں کرنے لگیں گھر میں کوئی دادا نانا کوئی ماموں چچا کہتا۔ شیخ صاحب کی آنکھیں دُکھنے آئیں چند روز ضعفِ بصر کا بہانہ کرکے ظاہر کیا کہ آنکھیں معذور ہوگئیں مطلب یہ تھا کہ اہلِ حسن کے دیدار سے آنکھیں سُکھ پائیں۔ چنانچہ بےتکلف گھروں میں جانے لگے اب پردہ کی ضرورت کیا ہے یہ بھی قاعدہ ہے کہ میاں بیوی جس مہمان کی بہت خاطر کرتے ہیں۔ نوکر اس سے جلنے لگتے ہیں۔ ایک دن دوپہر کو سوکر اُٹھے۔ شیخ صاحب نے لونڈی سے کہا کہ بڑے آفتابے میں پانی بھرلا۔ لونڈی نہ بولی۔ انھوں نے پھر پکارا۔ اُس نے کہا کہ بیوی جا ضرور میں لے گئی ہیں۔ ان کے مُنہ سے نکل گیا کہ عیبائی دوانی ہوئی ہے۔ سامنے تو رکھا ہے۔ دیتی کیوں نہیں۔ بیوی دوسرے دالان میں تھیں۔ لونڈی گئی اور کہا کہ لو بی بیوی یہ مُوا کہتا ہے کہ وہ بندہ اندھا ہے یہ تو خاصہ سُوجھتا ہے۔ ابھی میرے ساتھ یہ واردات گزری۔ اُس وقت یہ راز کھلا مگر اُس

میں شُبہ نہیں کہ آخر آنکھوں کو رو بیٹھے ؎

عزیزِ فالِ بد کا ورد حالِ بد ※ مبادا کسے کو زند فالِ بد

(۱۳۷) مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار سے ایک دفعہ تنخواہ کو دیر ہوئی تو حُسنِ طلب میں غزل کا مطلع ملاحظہ طلب ہے ؎

جرأت اب بندی تنخواہ تو کہتے ہیں ہم ※ کہ خدا دیوے نجیب تک تو سلیمان کب دے

(۱۳۸) کربلا۔ ایک پرانا بھانڈ دلّی کا رہنے والا۔ نواب شجاع الدّولہ کے ساتھ گیا تھا[1] اور اپنے فن میں صاحبِ کمال تھا۔ ایک دن کسی محفل میں اس کا طائفہ حاضر تھا۔ شیخ جرأت بھی وہاں موجود تھے۔ اُس نے نقل کی۔ ایک ہاتھ میں لکڑی لے کر دوسرا ہاتھ اندھوں کی طرح بڑھایا۔ ٹٹول ٹٹول کر پھرنے لگا۔ اور کہنے لگا کہ حضور شاعر بھی اندھا شعر بھی اندھا مضمون بھی اندھا ؎

صنم سُنتے ہیں تیرے بھی کمر ہے ※ کہاں ہے کس طرف کو ہے کدھر ہے

---

[1] عہدِ محمد شاہی اور اس کے پیش پیش کا زمانہ خوش حالی کے لحاظ سے بہشتی زمانہ تھا۔ دربار سے جو امیر کسی طرف جاتا تھا وہ ضروری چیزیں اور کاروبار کے آدمی دلّی سے اپنے ساتھ لے جاتا تھا تاکہ ہر کام۔ ہر رسم۔ ہر بات اور کارخانے کا محاورہ وہی موجود رہے۔ اخلاف کا ہی نواب سراج الدولہ مرشدآباد کے صوبہ ہو کر گئے تو علاوہ منصب داروں اور ملازموں کے کئی بھانڈ دو تین گویئے دو تین رنڈیاں۔ ایک دو بھگتیے۔ دو تین نان بائی (بقیہ نوٹ برصفحہ آئندہ)

شیخ صاحب بہت خفا ہوئے مگر یہ بھی سید انشا اور مرزا قتیل کے جتھے کے جزو اعظم تھے گھر آکر انھوں نے بھی اُس کی ہجو کہہ دی اور خوب خاک اڑائی اُسے سُن کر کر بلا بہت کڑھا چنانچہ دوسرے جلسہ میں پھر اندھے کی نقل کی اسی طرح لاٹھی لے کر پھرنے لگا۔ ان کی ایک غزل ہے ؎

امشب تری زلفوں کی حکایات ہے واللہ * کیا رات ہے کیا رات ہے کیا رات ہے واللہ

ہر رات کے لفظ پر لکڑی کا سہارا بدلتا تھا۔ کیا رات ہے کیا رات ہے کیا رات ہے واللہ۔ اس غزل کے ہر شعر کا دوسرا مصرع ایک ہی ڈھنگ پر ہے چنانچہ ساری غزل کو اسی طرح محفل میں گاتا پھرا شیخ صاحب اور بھی غصہ ہوئے اور پھر آکر ایک ہجو کہی ترجیع بند تھا ؏

"اگلا جھوٹے بگلا جھوٹے ساون اس کربلا پھوٹے"

اس کو بھی خبر ہوئی۔ بہت جلا بھنا۔ پھر کسی محفل میں ایک زرچاکا سوانگ بھرا اور ظاہر کیا کہ اس کے پیٹ میں بھتنا گھس گیا ہے خود ملا بن کر

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) ایک دو کنجڑے اور کھڑ بھونجے تک بھی ساتھ ہو لیے گئے اور وہ ایسا وقت تھا کہ دلی کا کھڑ بھونجا بھی دس بارہ روپئے مہینے بغیر دلی سے نہ نکلتا تھا ۱۲ یہ شعر شاہ مبارک آبرو کا ہے ۱۲

شامت آئی۔ میاں[۱] جرأت کی خوش مزاجی۔ لطیفہ گوئی مسخرا پن کی حد سے گزری ہوئی تھی اور ہندوستان کے امیروں کو نہ اس سے ضروری کوئی کام۔ نہ اس سے زیادہ کوئی نعمت ہی کہتے ہیں مرزا قتیل سید انشا کا اور ان کا یہ حال تھا کہ گھر میں رہنے نہ پاتے تھے۔ آج ایک امیر کے ہاں ہیں۔ دوسرے دن دوسرے امیر آئے سوار کیا اور ساتھ لے گئے ۴۔۵ دن وہاں رہے۔ کوئی اور نواب آئے وہاں سے وہ لے گئے جہاں جائیں آرام و آسائش سے زیادہ عیش کے سامان موجود۔ رات دن قہقہے اور چہچہے۔ ایک بیگم صاحب نے گھر میں ان کے چٹکلے اور نقلیں سنیں۔ بہت خوش

---

[۱] جرأت تخلص، قلندر بخش نام۔ اصلی نام یحییٰ امان تھا، اکبر آبادی مشہور ہیں مگر باپ ان کے حافظ امان خاص دلی کے رہنے والے تھے۔ چاندنی چوک دلی میں رائے مان کا کوچہ انہیں کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۲۱۵ھ میں لکھنؤ پہنچے اور مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں ملازم ہوئے عین جوانی میں چیچک کے صدمے سے نابینا ہو گئے۔
۱۲۲۵ھ میں فوت ہوئے شیخ ناسخ نے تاریخ کہی۔

جب میاں جرأت کا باغ دہر سے ✻ گلشن فردوس کو جانا ہوا
مصرعِ تاریخ ناسخ نے کہا ✻ ہائے ہندوستان کا شاعر موا
۱۲۲۵ھ

✻

ہوئیں اور نواب صاحب سے کہا کہ ہم بھی باتیں سُنیں گے۔ گھر میں لاکر کھانا کھلاؤ۔ پردے یا چلمنیں چھٹ گئیں اندر وہ بیٹھیں باہر یہ بیٹھے۔ چند روز کے بعد خاص خاص بیبیوں کا برائے نام پردہ رہا۔ باقی گھر والے سامنے پھرنے لگے۔ رفتہ رفتہ یگانگی کی یہ نوبت ہوئی کہ آپ بھی باتیں کرنے لگیں گھر میں کوئی دادا نانا کوئی ماموں چچا کہتا۔ شیخ صاحب کی آنکھیں دُکھنے آئیں چند روز ضعفِ بصر کا بہانہ کرکے ظاہر کیا کہ آنکھیں معذور ہوگئیں مطلب یہ تھا کہ اہلِ حسن کے دیدار سے آنکھیں سُکھ پائیں۔ چنانچہ بےتکلف گھروں میں جانے لگے اب پردہ کی ضرورت کیا ہے یہ بھی قاعدہ ہے کہ میاں بیوی جس مہمان کی بہت خاطر کرتے ہیں۔ نوکر اس سے جلنے لگتے ہیں۔ ایک دن دوپہر کو سوکر اُٹھے۔ شیخ صاحب نے لونڈی سے کہا کہ بڑے آفتابے میں پانی بھر لا۔ لونڈی نہ بولی۔ انہوں نے پھر پکارا۔ اُس نے کہا کہ بیوی جا ضرور میں لے گئی ہیں۔ ان کے مُنہ سے نکل گیا کہ غیبانی دوانی ہوئی ہے۔ سامنے تو رکھا ہے۔ دیتی کیوں نہیں۔ بیوی دوسرے دالان میں تھیں۔ لونڈی گئی اور کہا کہ اوئی بیوی یہ مُوا کہتا ہے کہ وہ بندہ اندھا ہے یہ تو خاصہ سُجاکھا ہے۔ ابھی میرے ساتھ یہ واردات گزری۔ اُس وقت یہ راز کُھلا مگر اُس

میں شُبہ ہیں کہ آخر آنکھوں کو رو بیٹھے ؎

مزن فالِ بد کا ورد حالِ بد ٭ مبادا کسے کو زند فالِ بد

(۱۳۷) مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار سے ایک دفعہ تنخواہ کو دیر ہوئی تو حُسنِ طلب میں غزل کا مطلع ملاحظہ طلب ہو ؎

جرأت اب بند ہی تنخواہ تو کہتے ہیں ہم ٭ کہ خدا دیوے نجیب تک تو سلیماں کب دے

(۱۳۸) کمبلا۔ ایک پرانا بھانڈ دلی کا رہنے والا۔ نواب شجاع الدولہ[1] کے ساتھ گیا تھا اور اپنے فن میں صاحبِ کمال تھا۔ ایک دن کسی محفل میں اس کا طائفہ حاضر تھا۔ شیخ جرأت بھی وہاں موجود تھے۔ اُس نے نقل کی۔ ایک ہاتھ میں لکڑی لے کر دوسرا ہاتھ اندھوں کی طرح بڑھایا۔ ٹٹول ٹٹول کر پھرنے لگا۔ اور کہنے لگا کہ حضور شاعر بھی اندھا شعر بھی اندھا مضمون بھی اندھا ؎

صنم سُنتے ہیں تیرے بھی کمر ہے ٭ کہاں ہے کس طرف کو ہے کدھر ہے

---

[1] عہدِ محمد شاہی اور اس کے پیش پیش کا زمانہ خوش حالی کے لحاظ سے بہشتی زمانہ تھا۔ دربار سے جو امیر کسی طرف جاتا تھا وہ ضروری چیزیں اور کاروبار کے آدمی دلی سے اپنے ساتھ لے جاتا تھا تاکہ ہر کام۔ ہر رسم۔ ہر بات اور کارخانے کا محاورہ وہی ہو جو دارالخلافہ کا ہے نواب سراج الدولہ مرشدآباد کے صوبہ ہو کر گئے تو علاوہ منصب داروں اور ملازموں کے کئی بھانڈ۔ دو تین گویے۔ دو تین رنڈیاں۔ ایک دو کھگیے۔ دو تین نان بائی (بقیہ نوٹ برصفحہ آئندہ)

شیخ صاحب بہت خفا ہوئے مگر یہ بھی سید انشا اور مرزا قتیل کے جتھے کے جزو اعظم تھے گھبرا کر انہوں نے بھی اُس کی ہجو کہہ دی اور خوب خاک اڑائی اُسے سُن کر کہا بہت کُڑھوایا چنانچہ دوسرے جلسہ میں پھر اندھے کی نقل کی اسی طرح لاٹھی لے کر پھرنے لگا۔

ان کی ایک غزل ہے

اے شب تری زلفوں کی حکایات ہے واللہ۔ کیا رات ہے کیا رات ہے کیا رات ہے واللہ

ہر رات کے لفظ پر لکڑی کا سہارا بدلتا تھا۔ کیا رات ہے کیا رات ہے کیا رات ہے واللہ۔ اس غزل کے ہر شعر کا دوسرا مصرع ایک ہی ڈھنگ پر ہے چنانچہ ساری غزل کو اسی طرح محفل میں گاتا پھرا شیخ صاحب اور بھی غصہ ہوئے اور پھر کر ایک ہجو بھی ترجیع بند کہا ع

"اگلا جھوٹے بگلا جھوٹے ساون اس کو لیا پھوٹے"

اس کو بھی خبر ہوئی۔ بہت جلا بھنا۔ پھر کسی محفل میں ایک زنجیر کا سوانگ بھرا اور ظاہر کیا کہ اس کے پیٹ میں کھٹنا گھس گیا ہے خود ملا بن کر

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) ایک دو کنجڑے اور کچھ بھوسے تک بھی ساتھ لے گئے اور وہ ایسا وقت تھا کہ دلی کا کچھ بھوسہ بھی دس بارہ روپیے جیب پھیر دلی سے نہ نکلتا تھا۔ سو یہ شعر شاہ مبارک آبرو کا ہے۔!!

بیٹھا اور جس طرح جنّات اور سیانوں میں لڑائی ہوتی ہی اسی طرح جھگڑتے جھگڑتے بولا کہ ارے نامراد کیوں غریب ماں کی جان کا لاگو ہوا ہی جراٗت ہی تو باہر نکل آ کہ ابھی جلا کر خاک کر دوں۔ آخر اب کی دفعہ اُنہوں نے ایسی خبر لی کہ کربلا خدمت میں حاضر ہوا۔ خطا معاف کروائی اور کہا کہ میں اگر آسمان کے تارے توڑ لاؤں گا تو بھی اس کا چرچا وہیں تک رہے گا جہاں تک دائرۂ محفل ہی۔ آپ کا کلام مُنہ سے نکلتے ہی عالم میں مشہور ہو جائے گا اور پتھر کی لکیر ہوگا کہ قیامت تک نہ مٹے گا۔ بس اب میری خطا معاف فرمائیے۔

(۱۳۹) لطیفہ۔ ایک دن میر انشاء اللہ خاں جُراٗت کی ملاقات کو آئے دیکھا تو سر جھکائے بیٹھے کچھ سوچ رہے ہیں۔ اُنہوں نے پوچھا کہ کس فکر میں بیٹھے ہو؟ جُراٗت نے کہا کہ ایک مصرع خیال میں آیا ہی چاہتا ہوں کہ مطلع ہو جائے۔ اُنہوں نے پوچھا کہ کیا ہی؟ جُراٗت نے کہا کہ خوب مصرع ہی مگر جب تک دوسرا مصرع نہ ہوگا تب تک نہ سُناؤں گا۔ نہیں تو تم مصرع لگا کر اُسے بھی چھین لو گے۔ سید انشا نے بہت اصرار کیا۔ آخر جُراٗت نے پڑھ دیا ع

"اس زلف پہ پھبتی شبِ دیجور کی سوجھی"

سید انشا نے فوراً کہا ع "اندھے کو اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی"

جرأت ہنس پڑے اور اپنی لکڑی اٹھا کر مارنے کو دوڑے۔ دیر تک سید انشا آگے آگے بھاگتے پھرے اور یہ پیچھے پیچھے ٹٹولتے پھرے اللہ اکبر! کیا شگفتہ مزاج لوگ تھے۔ کیا خوش دلی اور فارغ البالی کے زمانے تھے۔

(۱۴۰) سید انشا نے ان کے نام کا معمہ کہا تھا "سر مونڈی نگوڑی گجراتن" لطیفہ اس میں یہ تھا کہ گجراتن ان کی ماں کا نام تھا۔

(۱۴۱) نواب محبت خاں کے مختار نے ایک دفعہ جاڑے میں معمولی پوشاک دینے میں کچھ دیر کی۔ جرأت نے رباعی کہہ کر کھڑے کھڑے خلعت حاصل کیا۔ رباعی

مختاری پہ آپ کیجیے گا نہ گھمنڈ ※ کہتے ہیں جسے نوکری ہے رنج ارنڈ
سرمائی دلائیے ہماری ورنہ ※ تم کھاؤ گے گالیاں جو ہم کھائیں گے ٹھنڈ

(۱۴۲) مشاعرے میں بادشاہ بھی اپنی غزل بھیجا کرتے تھے۔ اور بادشاہوں کا کلام جیسا ہوتا ہے وہ ظاہر ہے۔ سید انشا[1] نے حضور میں

---

[1] انشا تخلص سید انشاء اللہ خاں نام میر ماشاء اللہ خاں والد ماجد کا اسم گرامی تھا جو امیر الامرا نواب ذو الفقار خاں کے عہد میں دلی آئے تھے اُس وقت سامانِ امارت کے ساتھ دو ہاتھی بھی تھے۔ مرشد آباد میں نواب سراج الدولہ کی رفاقت میں تھے تو اٹھارہ ہاتھی دروازے پر جھومتے تھے۔ سید انشاء وہیں پیدا ہوئے (بقیہ نوٹ صفحہ آئندہ)

عرض کی کہ فلاں فلاں اشخاص حضور کی غزل پر تمسخر اور مضحکہ کرتے ہیں۔ بادشاہ اگرچہ اُن خانہ زاد انِ قدیم پر ہر طرح قدرت رکھتے تھے۔ مگر اتنا کیا کہ مشاعرے میں غزل بھیجنی موقوف کر دی۔ یاروں کو بھی خبر لگ گئی۔ نہایت رنج ہوا چنانچہ بعد اس کے جو مشاعرہ ہوا تو اُس میں کمریں باندھ باندھ کر آئے۔ اور ولی اللہ محب نے یہ قطعہ پڑھا۔

مجلس میں چکے چاہیے جھگڑا شعر کا ٭ ایسے ہی کسی صاحبِ توقیر کے آگے
یہ بھی کوئی دانش ہو کہ پہنچے یہ قضایا ٭ اکبر شہیں یا شاہِ جہاں گیر کے آگے

مرزا عظیم بیگ نے کہا بابا میں تو اپنی عرض حال میں اپنے استاد کے ایک شعر پر قناعت کی ہو کہ ابھی تضمین ہو گیا ؎

عظیم اب گو ہمیشہ سے ہی یہ شعر کہنا شعار اپنا ٭ طرف ہر اک سے ہو محبت کرتا نہیں ہے کچھ افتخار اپنا

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) آخر دلّی سے دل اُچاٹ ہوا آصف الدولہ کی قدردانی کا شہرہ سُن کر لکھنؤ گئے اور مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں پہنچے بسنت سنگھ نشاط کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہو کہ ۱۲۳۳ھ میں انتقال ہوا۔ تاریخ

خبر انتقالِ میر انشا ٭ دلِ غمدیدہ تا نشاط شنفت
سالِ تاریخ او زجانِ اجل ٭ "عرفی وقت بود انشا گفت"
۱۲۳۰ + ۳ = ۱۲۳۳ھ

۵۱؎ یہ مشاعرہ ایک خطرناک معرکہ تھا۔ حریفوں نے تیغ و تفنگ اور سلحۂ جنگ سنبھالے تھے۔ بھائی اور دوستوں کو ساتھ لیا تھا بعض کو اِدھر اُدھر لگا رکھا تھا اور بزرگانِ دین کی نیازیں مان مان کر مشاعرے میں گئے تھے ۱۲۰

کئی شگوفے باز کھنڈ گو یوں میں ہے مزہ ہوا عقبا اپنا جنہوں کی نظر وں میں ہم سبک ہیں انہیں کو وقار اپنا

"عجب طرح کی ہوئی فراغت گدھوں پہ ڈالا جو بار اپنا"

دریائے مواج کے آگے گھاس پھوس کی کیا حقیقت تھی۔ سید انشا غزل فخریہ کہہ کر لائے تھے۔ وہ پڑھی جس کا ہر شعر دلوں پر توپ کے گولے کا کام کرتا تھا۔

بعد ان کے حکیم میر قدرت اللہ خاں قاسم کے سامنے شمع آئی۔ اُنھوں نے اتنا کہا کہ سید صاحب ذرا اس اثقیل ما ثقیل کو بھی ملاحظہ فرمایئے۔ میر مشاعرہ[1] کو خیال ہوا کہ سید انشا کی ہجو کہی ہوگی مبادا شرفا میں بے لطفی حد سے بڑھ جائے اسی وقت اُٹھے کہ دونوں میں صلح کروا دیں۔ سید انشا نے بھی شرافتِ خاندانی اور علو حوصلہ کو کام کیا اُٹھ کر حکیم صاحب کے گلے لپٹ گئے اور کہا کہ حضرت حکیم صاحب! آپ میرے بھی عم۔ اس پر صاحب حلم صاحب فضل خاک بدہنم

---

[1] نواب کے اخلاق کا یہ عالم تھا کہ پہلے مسند تکیہ لگا کر جلسہ میں بیٹھا کرتے تھے مرزا عظیم بیگ نے اپنے دوستوں سے کہا کہ ہمیں کیا غرض ہے جو مسند نشینوں کے جلسوں میں جا کر حاشیہ نشین بنیں نواب نے بہت عذر سے کہلا بھیجا کہ آپ صاحب تشریف لائیں کچھ مضائقہ نہیں میں بھی احباب کے ساتھ چاندنی پر بیٹھوں گا اُس دن سے مسند اُٹھا ڈالی۔ ہر چند اکثر اعزہ اور شرفا نے کہا ہرگز نہ مانا سب کے برابر بیٹھتے رہے۔ ۱۲

بھلا میں آپ پر طنز کروں گا۔ البتہ مرزا عظیم بیگ سے شکایت ہے کہ وہ خواہ مخواہ بد دماغی کرتے ہیں۔ اور داد دینی تو درکنار شعر پر سر تک نہیں ہلاتے۔ آخر کس برتے پر۔ غرض کہ سب صلح پر خاتمہ ہو گیا۔

(۱۴۳) دلّی میں اگرچہ بادشاہ اُس وقت فقط بادشاہِ شطرنج تھا یہاں تک کہ مال و دولت کے ساتھ غلام قادر نابکار نقدِ بصارت تک بھی لے گیا تھا۔ مگر یہ اپنا مطلب ہزار طرح سے نکال لیتے تھے مثلاً جمعرات کا دن ہوتا تو باتیں کرتے کرتے دفعتہً خاموش ہوتے اور کہتے کہ پیر و مرشد غلام کو اجازت ہے؟ بادشاہ کہتے خیر باشد کہاں؟ کہاں؟ یہ کہتے حضور آج جمعرات ہے۔ غلام۔ نبی کریم جائے شاہِ دین و دُنیا کا دربار ہے کچھ عرض کرے۔ شاہ عالم بہ ادب کہتے کہ ہاں ہاں بھئی ضرور جایئے سید انشاء اللہ خاں ہمارے لئے بھی کچھ عرض کرنا۔ یہ عرض کرتے کہ حضور! غلام کی اور آرزو کونسی ہے؟ یہی دین کی آرزو یہی دُنیا کی مراد! یہ کہہ کر پھر خاموش ہوتے۔ بادشاہ کچھ اور بات کرنے لگتے۔ ایک لمحہ کے بعد پھر یہ کہتے کہ پیر و مرشد! پھر غلام کو اجازت ہو۔ بادشاہ کہتے کہ ہیں اے بھئی میر انشاء اللہ خاں ابھی تم گئے نہیں؟ یہ کہتے حضور بادشاہ عالیجاہ کے دربار میں غلام خالی ہاتھ کیوں کر جائے۔

کچھ نذر و نیاز۔ کچھ چراغی کو تو مرحمت ہو! بادشاہ کہتے ہاں بھئی درست درست اب مجھے تو خیال ہی نہیں رہا۔ جیب میں ہاتھ ڈالتے اور کچھ روپیے نکال کر دیتے۔ میر انشاء اللہ خاں لیتے اور ایک دو فقرہ دعائیہ کہہ کر پھر کہتے کہ حضور دوسری جیب میں دستِ مبارک جائے تو فدوی کا کام چلے کیوں کہ وہاں سے پھر کبھی تو آنا ہی۔ بادشاہ کہتے کہ ہیں ہاں بھئی سچ ہے سچ ہے بھلا وہاں سے دو دو کھجوریں تو کسی کو لا کر دو۔ بال بچے کیا جانیں گے کہ تم آج کہاں گئے تھے۔ اگرچہ ان فقروں سے یہ کام نکال لیتے تھے۔ لیکن پھر کب تک؟ آخر دلّی سے دل اُچاٹ ہوا۔ لکھنؤ میں آصف الدولہ کی سخاوتوں نے حاتم کے نام کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اور لوگ بھی کمال کے ایسے جویا تھے کہ جو دلّی سے گیا پھر نہ آیا۔ اس لئے اُدھر کا رخ کیا۔

(۱۴۴) سعادت علی خاں نواڑے میں لیٹے ہوئے میر انشاء اللہ خاں کی گود میں سر دھرا ہوا۔ سرور کے عالم میں دریا کی سیر کرتے چلے جاتے تھے۔ لبِ دریا ایک حویلی پر لکھا دیکھا۔ حویلی علی نقی بہادر کی۔ کہا کہ انشا دیکھو کسی نے تاریخ کہی مگر نظم نہ کر سکا بھئی تم نے دیکھا بہت خوب مادّہ ہے۔ اسے رباعی کر دو اسی وقت عرض کی

نہ عربی نہ فارسی نہ ترکی ٭ نہ سم کی نہ تال کی نہ سُر کی
یہ تاریخ کہی ہے کسی لُرکی ٭ حویلی علی نقی خاں بہادر کی

(۱۴۵) میر انشاء اللہ خاں کہتے ہیں کہ یہاں کے دربار کا عالم کچھ اور ہے۔ کیا کہوں۔ لوگ جانتے ہیں کہ میں شاعری کر کے نوکری بجالاتا ہوں۔ مگر میں خود نہیں جانتا کہ کیا کر رہا ہوں؟ دیکھو صبح کا گیا گیا شام کو آیا تھا۔ کمر کھول رہا تھا جو چوبدار آیا کہ جنابِ عالی پھر یاد فرماتے ہیں گیا تو دیکھتا ہوں کہ کوٹھے پر فرش ہے۔ چاندنی رات ہے۔ بیچ دار چھپر کھٹ میں آپ بیٹھے ہیں۔ پھولوں کا گہنا سامنے دھرا ہے۔ ایک گجرا ہاتھ میں ہے اُسے اُچھالتے ہیں اور پاؤں کے اشارے سے چھپر کھٹ آگے بڑھتا جاتا ہے۔ میں نے سلام کیا۔ حکم ہوا کہ انشا کوئی شعر تو پڑھو۔ اب فرمائیے ایسی حالت میں کہ اپنا ہی قافیہ تنگ ہو۔ شعر کیا خاک یاد آئے۔ خیر اُس وقت یہی سمجھ میں آیا۔ وہیں کہہ کر پڑھ دیا۔

لگا چھپر کھٹ میں چار پیئے اُچھالا تو نے جو لے کے گجرا
تو موجِ دریائے چاندنی میں وہ ایسا چلتا تھا جیسے بجرا

یہی مطلع سُن کر خوش ہو گئے۔

(۱۴۶) ایک دن نواب صاحب کے ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے

لا بی سے گھبرا کر دستار سر سے رکھ دی تھی۔ منڈا ہوا سر دیکھ کر نواب
بھی بات میں چہل آئی۔ ہاتھ بڑھا کر پیچھے سے ایک دھول ماری۔
آپ نے جلدی سے ٹوپی سر پر رکھ لی اور کہا سبحان اللہ بچپن میں
بزرگ سمجھایا کرتے تھے وہ بات سچ ہی کہ ننگے سر کھانا کھاتے ہیں
تو شیطان دھولیں مارا کرتا ہی۔

(۱۴۷) سعادت علی خاں کہ ہر امر میں سلیقہ اور صفائی کا پابند تھا۔
اُس نے حکم دیا تھا کہ اہلِ دفتر خوش خط لکھیں۔ اور فی غلطی ایک روپیہ
جرمانہ۔ اتفاقاً اعلیٰ درجے کے اہلِ انشا میں ایک مولوی صاحب
تھے۔ اُنھوں نے فردِ حساب میں اجناس کو اجنا لکھ دیا سعادت علی خاں
تو ہر شے پر خود نظر رکھتے تھے اُن کی بھی نگاہ پڑ گئی۔ مولویوں کو
جواب دینے میں کمال ہوتا ہی اُنھوں نے کچھ قاموس کچھ صراح سے
اجنا کے معنے بتائے کچھ قواعد نحو سے ترجیح میں لے گئے۔ نواب
نے اُنہیں اشارہ کیا۔ اُنھوں نے مارے رباعیوں اور قطعوں کے
اُلّو کر دیا۔ رباعی:۔

اجناس کی فرد پر یہ اجنا کیسا؟ ※ یاں ابرِ لغات کا گرجنا کیسا؟
گو ہوں اجنا کے معنے جو چیز لگے ※ لیکن یہ نئی اپج اُپجنا کیسا؟

اُن مولوی صاحب کا نام مولوی سخن تھا۔ چنانچہ اُس کا اشارہ کرتے ہیں ؎

ترخیم کے قاعدے سے سجنا لکھیے * اور لفظ خروجنا کو خجنا
گر ہم کو اجی نہ لکھیے ہووے لکھنا * تو کرکے مرخم اس کو اجنا
اجناس کے بدلے لکھئے اجنا کیا خوب * قاموس کی رعد کا گرجنا کیا خوب
از روئے لغت نئی اپج کی لی ہے * اس تان کے بیچ کا اپجنا کیا خوب

پوربی لہجے میں

اجناس کے موقعن میں اجنا آیا * سلماے علوم کا یہ سجنا آیا
اجنا چیز نیست کاں بروید ز زمیں * یہ تخمِ لغت کا لو اپجنا آیا

(۱۴۸) رات بہت گئی تھی اور ان کے لطائف و ظرائف کی آتشبازی چھوٹ رہی تھی۔ یہ رخصت چاہتے تھے اور موقع نہ پاتے تھے نواب کے ایک مصاحب باہر کے رہنے والے اکثر اہلِ شہر کی باتوں پر طعن کیا کرتے تھے اور نواب صاحب سے کہا کرتے تھے کہ آپ خواہ مخواہ سید انشا کے کمال کو بڑھاتے چڑھاتے ہیں حقیقت میں وہ اتنے نہیں۔ اس وقت اُنھوں نے لقا کا یہ مطلع نہایت تعریف کے ساتھ پڑھا ؎

دیکھ آئینہ جو کہتا ہے کہ اللہ رے میں * اُس کا میں دیکھنے والا ہوں لقا واہ رے میں

سب نے تعریف کی۔ نواب نے بھی پسند کیا۔ اُنھوں نے کہا کہ حضور سید انشا سے اس مطلع کو کہوائیں تو اب اُن کی طرف دیکھا۔ مطلع حقیقت میں

لاجواب تھا۔ اُنھوں نے بھی ذہن لڑایا۔ فکر نے کام نہ کیا۔ اُنھوں نے
پھر تقاضا کیا۔ سیّد موصوف نے فوراً عرض کی کہ جنابِ عالی مطلع
تو نہیں ہوا مگر شعر حسبِ حال ہو گیا ہے حکم ہو تو عرض کروں ؎
ایک مٹکی کھڑا دروازہ پہ کہتا تھا رات * آپ تو پھیرے جا پاڑے ہے باہرے ہیں

(۱۴۹) ایک دن نواب نے روزہ رکھا اور حکم دیا کوئی آنے نہ
پائے سید آنشا کو ضروری کام تھا۔ یہ پہنچے۔ پہرہ دار نے کہا کہ
آج حکم نہیں، آگے آپ مالک ہیں۔ باوجود انتہائے مرحمت کے
یہ بھی مزاج سے ہشیار رہتے تھے۔ تھوڑی دیر تامل کیا۔ آخر کمر کھول
دستار سر سے بڑھا قبا اُتار ڈالی۔ اور دوپٹہ عورتوں کی طرح
سے اوڑھ کر ایک ناز و انداز کے ساتھ سامنے جا کھڑے ہوئے۔
جوں ہی اُن کی نظر پڑی۔ آپ انگلی ناک پر دھر کے بولے ؎

میں تیرے صدقے نہ رکھ اے مری پیاری روزہ
بندی رکھ لے گی ترے بدلے ہزاری روزہ

نواب بے اختیار ہنس پڑے۔ جو کچھ کہنا سُننا تھا وہ کہا اور ہنستے
کھیلتے چلے آئے۔

(۱۵۰) ان کے حالات سے یہ بھی [معلو]م ہوتا ہے کہ انھوں نے عام
خلائق خصوصاً اہلِ دہلی کی رفا[ہ] ... [خ]ارج کار کا بیڑا اٹھایا ہوا تھا

چنانچہ لکھنؤ میں میر علی صاحب ایک مرثیہ خواں تھے کہ علم موسیقی میں اُنہوں نے حکما کا مرتبہ حاصل کیا تھا مگر اپنے گھر ہی میں مجلس کر کے پڑھتے تھے کہیں جاکر نہ پڑھتے تھے۔ نواب نے اُن کے شہرۂ کمال سے مشتاق ہو کر طلب کیا اُنہوں نے انکار کیا۔ اور کئی پیغام سلام کے بعد یہ بھی کہا کہ اگر وہ حاکم وقت ہیں تو میں بھی سیادت کے اعتبار سے شاہزادہ ہوں اُنہیں میرے ہاں آنے سے عار کیا ہے؟ نواب نے کہا کہ سیّد میرے ہاں ہزاروں سے زیادہ ہیں۔ میر صاحب نے اگر فخر پیدا کیا تھی کیا کہ سیّد تھے اب ڈوم بھی ہوگئے خیر اُنہیں اختیار ہے۔ میر علی صاحب نے یہ سُن کر خیالات چند در چند سے فوراً دکن کا ارادہ کیا۔ سیّد انشا جو شام کو گھر آئے تو دیکھا کہ کچھ سامان سفر ہو رہا ہے۔ سبب پوچھا تو معلوم ہوا کہ میر علی صاحب لکھنؤ سے جاتے ہیں۔ چوں کہ آپ کے بھتیجے بھانجے بھی اُن کے شاگرد ہیں وہ بھی اُستاد کی رفاقت کرتے ہیں۔ میر علی صاحب کے جانے کا سبب پوچھا تو وہ معاملہ معلوم ہوا۔ اُسی وقت کمر باندھ کر پہنچے سعادت علی خاں نے متحیّر ہو کر پوچھا کہ خیر باشد! پھر کیوں آئے اُنہوں نے ایک غزل پڑھی جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

دولت نئی ہے اور سعادت علی بنا ٭ یارب بنا نئی میں ہمیشہ بنی رہے

پھر کہا کہ حضور! غلام جو اس وقت رخصت ہو کر چلا تو دل نے کہا کہ اپنے دولھا کی دُلھن (عروسِ سلطنت) کو ذرا دیکھوں! حضور! واقعی کہ بارہ ابھرن سولہ سنگار سے سجی تھی۔ سر پر جھومر۔ وہ کون؟ مولوی دلدار علی صاحب۔ کانوں میں جُھمکے وہ کون؟ دونوں صاحبزادے گلے میں نولکھا ہار۔ وہ کون؟ خانِ علّامہ۔ غرض اسی طرح چند زیوروں کا نام لے کر کہا کہ حضور غور جو کرتا ہوں تو ناک میں نتھ نہیں۔ دل دھک سے ہو گیا کہ اللہ سہاگ کو قائم رکھّے۔ یہ کیا! نواب نے پوچھا کہ پھر وہ کون؟ کہا حضور نتھ۔ میر علی صاحب! بعد اس کے کیفیتِ مفصّل بیان کی۔ نواب نے ہنس کر کہا کہ اُن کی دور اندیشیاں بے جا ہیں۔ میں ایسے صاحبِ کمال کو فخرِ لکھنؤ سمجھتا ہوں۔ غرض اس شہرتِ بے اصل کے دفعیہ کے لئے ترقی کا پروانہ اور ۵۰۰ روپئے کا خلعت لے کر وہاں سے پھرے۔

(۱۵۱) جان بیلی صاحب کہ اُس عہد میں رزیڈنٹ اودھ تھے اگرچہ سید انشا کا نام اور شہرۂ عام سُنتے تھے مگر دیکھا نہ تھا جب سید انشا نواب سعادت علی خاں کے پاس ملازم ہوئے تو ایک دن صاحب کے آنے کی خبر ہوئی۔ نواب نے کہا انشا آج ہم تمہیں بھی صاحب سے ملائیں گے۔ عرض کی کہ حضور کی ہر طرح پرورش ہے

مگر فدوی کے باب میں کچھ تقریبِ ملاقات کی ضرورت نہیں۔ غرض
جس وقت صاحبِ ممدوح آئے نواب اور وہ آمنے سامنے کرسیوں
پر بیٹھے۔ سید انشا نواب کے پیچھے کھڑے ہو کر رومال ہلاتے تھے
باتیں کرتے کرتے صاحب نے ان کی طرف دیکھا۔ انہوں نے ایک
چہرہ کی لی۔ انہوں نے آنکھیں نیچی کر لیں۔ مگر دل میں حیران ہوئے
کہ اس آدمی کی کیسی صورت ہے؟ یہ خیال کرتے ہی پھر نظر پڑی۔
اب کی دفعہ انہوں نے ایسا چہرہ بدلا کہ اُس سے بھی عجیب۔ وہ شرما کر
اور طرف دیکھنے لگے۔ پھر جو دیکھا تو انہوں نے ایسا منہ بنایا کہ
اس سے بھی الگ تھا۔ آخر نواب سے پوچھا کہ یہ مصاحب آپ
کے پاس کب ملازمت میں آئے؟ میں نے آج ہی انہیں دیکھا ہے۔
نواب نے کہا کہ ہاں آپ نے نہیں دیکھا۔ سید انشاء اللہ خاں
یہی ہیں۔ جان بیلی صاحب بہت ہنسے ان سے ملاقات کی۔ پھر تو
ان کی جادو بیانی نے ایسا تسخیر کیا کہ جب آتے پہلے پوچھتے کہ
سید انشا کجاست؟

(۱۵۲) جان بیلی صاحب کے ساتھ مولوی [illegible] خاں میر منشی رزیڈنسی
بھی آیا کرتے تھے۔ اِن کی اُن کی عجب لطف کی چوٹیں ہوتی تھیں
ایک دن انشا نے گفتگو میں کسی کی زبان [illegible] سے شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

اُنہوں نے کہا کہ گلستاں کے ہر شعر میں مختلف روایتیں ہیں اور لطف یہ ہے کہ کوئی کیفیت سے خالی نہیں چنانچہ ہو سکتا ہے ع

"شاید کہ پلنگ خفیہ باشد"

سعادت علی خاں نے سید انشا کی طرف دیکھا اُنہوں نے ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ حضور! میر منشی صاحب بجا فرماتے ہیں غلام نے بھی ایک نسخۂ گلستاں میں یہی دیکھا تھا ؎

تا مرد سخن نگفتہ باشد ٭ عیب و ہنرش نہفتہ باشد
در بیشہ گماں مبر کہ خالی ست ٭ شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

بلکہ وہ نسخہ بہت صحیح اور محشّیٰ تھا اُس میں گفتہ اور نہفتہ کے کچھ معنے بھی لکھے تھے۔

میر منشی صاحب! آپ کو یاد ہیں؟ وہ نہایت شرمندہ ہوئے جب وہ رخصت ہوئے تو سید انشا کہا کرتے میر منشی صاحب کا اللہ بیلی۔

(۱۵۳) ایک دن اُسی جلسے میں کچھ ایسا تذکرہ آیا کہ سعادت علی خاں نے کہا تجبر بالفتح بھی درست ہے۔ جان بیلی صاحب نے کہا کہ خلافِ محاورہ ہے۔ سعادت علی خاں بولے کہ خیر لغت کے اعتبار سے جب درست ہے تو استعمال میں کیا مضائقہ۔ اتنے میں سید انشا آ گئے۔ جان بیلی صاحب نے کہا کہ "کیوں سید انشا تجبر اور تجبّر میں تم کیا کہتے ہو؟" انہوں

یہاں کی خبر نہ تھی بے ساختہ کہہ بیٹھے کہ ہجر بالکسر! مگر ساتھ ہی سعادت علی خاں کی تیوری تاڑ گئے اور فوراً بولے کہ حضورؐ جب ہی تو جامی فرماتے ہیں ؎

شبِ وصل است طے شد نامۂ ہجر ٭ سَلَامٌ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ

یہ سُنتے ہی سعادت علی خاں شگفتہ ہوگئے اور اہلِ دربار ہنس پڑے۔

(۱۵۴) **مرزا سلیماں شکوہ** کا مکان لبِ دریا تھا۔ معلوم ہوا کہ کل یہاں ایک اشنان کا میلا ہے۔ سید انشا نے کہ رنگت کے گورے بدن کے فربہ۔ صورت کے جامہ زیب تھے۔ پنڈتانِ کشمیر کا لباس درست کر کے سب سامانِ پوجا پاٹ کا تیار کیا۔ صبح کو سب سے پہلے دریا کے کنارے ایک مہنت دھرم مورت بن کر جا بیٹھے اور خوب زور شور سے اشلوک پڑھنے اور منتر جپنے شروع کر دیئے۔ لوگ اشنان کے لیئے آنے لگے مگر عورت مرد بچہ بوڑھا جو آتا۔ الغرض خواہ مخواہ مرد آدمی دیکھ کر انہیں کی طرف جھکتا۔ یہ اُنہیں پوجا کرواتے تھے۔ تلک لگاتے تھے۔ جن دوستوں سے راز کہہ رکھا تھا اُنہوں نے مرزا سلیماں شکوہ کو خبر کی وہ مع جلسہ اُسی وقت لبِ بام آئے۔ دیکھیں تو فی الحقیقت اناج۔ آٹا۔ پیسے۔ کوڑیوں کے ڈھیر لگے ہیں۔ وہ بھی اس قدر کہ اور سب سے زیادہ۔ اس میں تفریحِ طبع یا

لیاقتِ ہرفنی کے اظہار کے ساتھ نکتہ یہ تھا کہ حضور خانہ زاد کو نبالِ دوش نہ سمجھیں نہ اس شاعری کا پابند جانیں جس کوچے میں جائے گا اوروں سے کچھ اچھا ہی نکلے گا۔

(۱۵۵) **فایق** تخلص ایک فلک زدہ شاعرہ تھا۔ خدا جانے کس بات پر خفا ہوا کہ اِن کی ہجو کہی اور خود لا کر سُنائی۔ اِنہوں نے بہت تعریف کی۔ بہت اُچھلے۔ بہت کودے۔ اور پانچ روپیئے بھی دیئے جب وہ چلا تو بولے ذرا ٹھیریئے گا۔ ابھی آپ کا حق باقی ہے۔ قلم اُٹھا کر یہ قطعہ لکھا اور حوالہ کیا ؎

فایقِ بے حیا چو ہجوم گفت ٭ دلِ من سوخت سوخت سوختہ بہ
صلۂ اش پنج روپیہ دادم ٭ دہنِ سگ بہ لقمہ دوختہ بہ

(۱۵۶) دلی میں حافظ احمد یار ایک معقول صحبت یافتہ نامور حافظ تھے۔ اور سرکارِ شاہی میں حافظانِ قرآن میں نوکر تھے۔ اگرچہ دُنیا میں ایسا کون تھا جس سے سیّد انشا یارانہ نہ برتیں مگر حافظ احمد یار کے بڑے یار تھے۔ اُن کا سجع کہا تھا ؏ اللہ حافظ احمد یار

(۱۵۷) حافظ صاحب ایک دن ملنے گئے رستے میں مینہ آگیا اور وہاں پہنچتے تک موسلا دھار برسنے لگا۔ یہ جا کر بیٹھے ہی تھے جو حرم سرا سے ننگے مُننگے ایک کھاروے کی لُنگی باندھے آپ دوڑے

آتے انھیں دیکھتے ہی اُچھلنے لگے۔ ہاتھ پھیلا پھیلا کر گرد پھرتے تھے اور سب کہے جاتے تھے ؎

پھر پھر چھاجوں برست نور ٭ رتو بلیاں دسمن دور

حافظ مذکور جب رخصت ہوتے تھے تو ہمیشہ کہا کرتے تھے ع

"اللہ حافظ احمد یار"

ایسے ایسے معاملے ہزاروں تھے کہ دن رات بات بات میں ہوتے رہتے تھے۔

(۱۵۸) نہایت افسوس کے قابل یہ بات ہے کہ سعادت علی خاں کے ہاتھوں سید انشا کا انجام اچھا نہ ہوا۔ اس کے مختلف سبب ہیں اوّل تو یہ کہ اگرچہ اپنی ہمہ رنگ طبیعت کے زور سے انھوں نے انہیں پرچا لیا تھا۔ مگر درحقیقت ان کے اور اُن کے معاملے کا مصداق ان کا مطلع تھا ؎

رات وہ بولے مجھ سے ہنس کر چاہ میاں کچھ کھیل نہیں

میں ہوں منسوخ اور تو ہی مقطع میرا تیرا میل نہیں

مثلاً اکثر میلوں تماشوں میں چلنے کے لئے کچھ احباب کا تقاضا کچھ اُن کی طبیعت اصلی کا تقاضا غرض انہیں جانا ضرور۔ اور یہ سعادت علی خاں کی طبع کے بالکل مخالف۔ اکثر ایسا ہوا کہ وہ اپنے کاغذات دیکھ رہے ہیں مصاحبوں کے ساتھ یہ بھی حاضر ہیں۔ اس میں ایک آدھ لطیفہ

بھی ہو جاتا ہے۔ انشا نے عرض کی حضور غلام کو اجازت ہے؟ نواب بولے کہ ہوں! کہاں؟ انہوں نے کہا کہ حضور آج آٹھوں کا میلہ ہے۔ اُنھوں نے کہا لاحول ولا قوۃ۔ سیّد انشا بولے کہ مناسب تو یہ تھا کہ حضور بھی تشریف لے چلتے۔ نواب نے کہا انشا ایسے نا روا مقاموں میں جانا تمہیں کس نے بتایا ہے! عرض کی۔ حضور وہاں تو جانا ایک اعتبار سے فرضِ عین ہے اور ایک نظر سے واجبِ کفائی ہے ایک لحاظ سے سُنت ہے۔ پھر سب کی توجیہیں بھی الگ الگ بیان کیں۔ آخر اسی عالمِ مصروفیت میں سُنتے سُنتے دق ہو کر نواب نے کہہ دیا۔ قصّہ مختصر کرو۔ اور جلدی سدھارو۔ اُسی وقت مونچھوں پر تاؤ دے کر بولے۔ کون ہے آج سوا سیّد انشا کے کہ جو کہے۔ اُسے عقل سے نقل سے۔ آیت سے اور روایت سے ثابت کر دے۔ ایسی باتیں بعض موقع پر نواب کو موجبِ تفریح ہوتی تھیں بعض دفعہ بمقتضائے طبیعتِ اصلی مکدر ہو جاتے تھے۔ خصوصًا جب کہ رخصت کے وقت خرچ مانگتے تھے۔ کیوں کہ وہ شاہِ عالم نہ تھا۔ سعادت علی خاں تھا ؎

گر جاں طلبی مضایقہ نیست ✻ زر مے طلبی سخن درین است

(۱۵۹) غضب یہ ہوا کہ ایک دن سرِ دربار بعض شرفائے خاندانی

کی شرافت و نجابت کے تذکرے ہو رہے تھے۔ سعادت علی خاں نے کہا کہ کیوں بھئی ہم بھی نجیب الطرفین ہیں۔ اسے اتّفاقِ تقدیر کہو۔ یا زیادہ گوئی کا ثمرہ سمجھو۔ سیّد انشا بول اٹھے کہ حضور، بلکہ انجب سعادت علی خاں حرم کے شکم سے تھے وہ چپ اور تمام دربار دَہم ہوگیا۔ اگرچہ اُنھوں نے پھر اور باتیں بنا بنا کر بات کو مٹانا چاہا مگر کمانِ تقدیر سے تیر نکل چکا تھا۔ وہ کھٹک دل سے نہ نکلی کہ وَلَدُ الجَارِیَۃِ اَنْجَبُ۔ (لونڈی کا بیٹا انجب ہوتا ہے)

(۱۶۰) ایک سقنی کو دیکھ کر شیخ صاحب[1] کی شوخیِ طبع کے مُنہ میں پانی بھر آیا ہے۔ اُس غزل کے چند شعر کہ ظریفانہ انداز میں ہیں ملاحظہ فرمائیے ؎

پانی بھرے ہے یاروں قرمزی دوشالا ٭ لنگی کی سج دکھا کر سقنی نے مار ڈالا

کاندھے پہ مشک رکھ جب قد کو خم کرے ہے ٭ کافر کا نشۂ حُسن ہو جائے ہے دوبالا

دریائے خوں میں کیوں کر ہم تم نہ ڈوبیں ٭ لنگی کے رنگ سے جب ساں تا کمر ہو لالا

یہ سب کچھ صحیح مگر جس شخص کا قلم آٹھ دیوان لکھ کر ڈال دے اُس کی

[1] مصحفی تخلص غلام ہمدانی نام، امروہہ کے رہنے والے تھے دہلی میں طالب العلمی کی حیثیت سے آئے تھے اور یہیں رہ پڑے چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں ؎

دلّی کہے ہیں جس کو زمانہ میں مصحفی ٭ میں رہنے والا بھی اُسی اُجڑے دیار کا

نواب آصف الدولہ کا زمانہ تھا یہ بھی لکھنؤ پہنچے اور مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار جو دلّی والوں کا معمولی ٹھکانا تھا۔ ملازم ہو گئے سنہ ۱۲۴۰ھ میں لکھنؤ ہی میں پیوندِ خاک ہوئے ۱۲۰

اُستادی میں کلام کرنا انصاف کی جان پر ستم کرنا ہے۔
اُن کی مشاقی اور پُرگوئی کو سب تذکروں میں تسلیم کیا ہے۔ سِن رسیدہ لوگوں کی زبانی سُنا کہ دو تین تختیاں پاس دھری رہتی تھیں۔ جب مشاعرہ قریب ہوتا تو اُن پر اور مختلف کاغذوں پر طرحِ مشاعرے میں شعر لکھنے شروع کرتے تھے اور برابر لکھے جاتے تھے۔ لکھنؤ شہر تھا۔ عین مشاعرے کے دن لوگ آتے آٹھ آنے سے ایک روپئے تک اور جہاں تک کسی کا شوق مدد کرتا وہ دیتا۔ یہ اُس میں سے ۹-۱۱-۲۱ شعر کی غزل نکال کر حوالہ کر دیتے تھے۔ اُن کے نام کا مقطع کر دیتے تھے۔ اور اصل سبب کمزوری کا یہ تھا کہ بڑھاپے میں شادی بھی کی تھی چنانچہ سب سے پہلے تو ایک سالا تھا وہ شعر چُن کرلے جاتا۔ پھر سب کو دے لے کر جو کچھ بچتا وہ خود دیتے اور اُس میں کچھ نون مرچ لگا کر مشاعرے میں پڑھ دیتے وہی غزلیں دیوانوں میں لکھی چلی آتی ہیں۔ بلکہ ایک مشاعرے میں جب شعروں پر بالکل تعریف نہ ہوئی تو انھوں نے تنگ ہو کر غزل زمین پر دے ماری اور کہا کہ روتے فلاکت سیاہ حین کی بدولت کلام کی یہ نوبت پہونچی ہے کہ اب کوئی سُنتا بھی نہیں۔ اس بات کا چرچا ہوا تو یہ عقدہ کھُلا کہ اِن کی غزلیں بکتی ہیں۔ اچھے اچھے

شعر تو لوگ مول لے جاتے ہیں جو رہ جاتے ہیں وہ ان کے حصہ
میں آتے ہیں۔

(۱۶۱) ایک مشاعرہ میں میر تقی مرحوم بھی موجود تھے۔ شیخ مصحفی نے
غزل پڑھی ؎

تنہا نہ وہ ہاتھوں کی حنا لے گئی دل کو * مکھڑے کے چھپانے کی ادا لے گئی دل کو

جب یہ شعر پڑھا ؎

یاں لعل فسوں سا نے باتوں میں لگایا * دے پیچ ادھر زلف اڑا لے گئی دل کو

تو میر صاحب قبلہ نے بھی فرمایا کہ بھئی ذرا اس شعر کو پھر پڑھنا۔ اُن کا اتنا
کہنا ہزار تعریفوں کے برابر تھا۔ شیخ موصوف اسی قدر الفاظ کو فرمانِ آل
تمغا اپنے کمال کا سمجھے بلکہ کئی دفعہ اُٹھ اٹھ کر سلام کیے اور کہا کہ میں
اس شعر کو اپنے دیوان میں ضرور لکھوں گا۔ کہ حضرت نے دوبارہ
پڑھوایا تھا۔

(۱۶۲) زمانے کی زبان کون پکڑ سکتا ہے۔ بے ادب گستاخ ناسخ پر دُم کٹے
بھینسے کی پھبتی کہا کرتے تھے۔ اسی رنگ روغن کی رعایت سے خواجہ
صاحب نے چوٹ کی ؎

روسیہ دشمن کا یوں پا پوش سے کیجے فگار * جیسے سلہٹ کی سپر پر زخم ہو شمشیر کا

شیخ صاحب[له] نے خود بھی اس کا عذر کیا ہے اور شاگرد بھی روغنِ قاز

[له] شیخ امام بخش نام ناسخ تخلص۔ آپ کی شاعری کا وطن لکھنؤ ہے مگر والد خدا بخش (بقیہ نوٹ برصفحہ آئندہ)

مل مل کر اُستاد کے رنگ کو چمکاتے تھے۔ اور حریف کے رنگ کو مٹاتے تھے۔ فقیر محمد خاں گویا نے کہا تھا ؎

ہے یقین گل ہو جو دیکھے گیسوئے دلبر چراغ ٭ آگے کالے کے بھلا روشن رہے کیونکر چراغ

ہیں گو کہ حسن سے ظاہر بہ مثلِ ماہ نہیں ٭ ہزار شکر کہ باطن مرا سیاہ نہیں (گویا)

فروغِ حسن پہ کب زور زلف چلتا ہے ٭ یہ وہ چراغ ہے کالے کے آگے جلتا ہے (ناسخ)

(۱۶۳) آغا کلب حسین خاں مرحوم انہیں اکثر بلایا کرتے تھے۔ اور مہینوں مہمان رکھتے تھے ان سے بھی فقط ذوقِ شعر کا تعلق نہ تھا۔ (مرزا آب لکھنوی) وہ بھی ایک شہزور شہسوار، ورزشی جوان تھے۔ سامان امیرانہ اور مزاجِ دوستانہ رکھتے تھے۔ چنانچہ ایک موقعہ پر کہ آغا صاحب سورام سرحدِ نوابی پر تحصیلدار ہو کر آئے۔ شیخ صاحب کو بلا بھیجا کہ چند روز سبزہ و صحرا کی سیر سے طبیعت کو سیراب فرمایئے۔ ایک دن بعض اقسام کے کھانے خاص شیخ صاحب کی نیت سے پکوائے تھے اس لئے وقت معمولی سے کچھ دیر ہو گئی۔ شیخ صاحب نے دیکھا کہ حرم سرا کی ڈیوڑھی سے نوکر اپنے اپنے کھانے لے کر چلے۔ بلا کر پوچھا کہ یہ کس کے لئے ہے؟ عرض کی کہ ہمارا کھانا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کا وطن لاہور تھا۔ وفات ۲۷-۱۲۵۵ھ سال کی عمر میں لکھنؤ ہی میں ہوئی میر علی ... شاگرد رشید نے تاریخ کہی ع دلا شعر گوئی اٹھی لکھنؤ سے - ۱۲۵۴ھ

فرمایا ادھر لاؤ۔ ان میں سے ۴۔۵ کا کھانا سامنے رکھوالیا۔ چاٹ پونچھ کر باسن حوالے کیے اور کہا کہ ہمارا کھانا آئے گا تو تم کھالینا آغا صاحب کو خبر جا پونہچی۔ اتنے میں آئیں یہاں کام ختم ہو چکا تھا۔

(۱۶۴) لکھنؤ سے نکلنے کا سبب یہ ہوا تھا کہ غازی الدین حیدر کے عہد میں جب ان کی تعریفوں کی آوازیں بہت بلند ہوئیں تو انھوں نے نواب معتمد الدولہ آغا میر نے اپنے وزیر سے کہا کہ اگر شیخ ناسخ ہمارے دربار میں آئیں اور قصیدہ سنائیں تو ہم انہیں ملک الشعراء خطاب دیں۔ معتمد الدولہ ان کے با اخلاص شاگرد تھے۔ جب یہ پیغام پونہچا یا تو انھوں نے بگڑ کر جواب دیا کہ مرزا سلیمان شکوہ[1] بادشاہ ہو جائیں تو وہ خطاب دیں۔ یا گورنمنٹ انگلشیہ خطاب دے۔ ان کا خطاب لے کر میں کیا کروں گا۔ نواب کے مزاج میں کچھ وحشت بھی تھی۔ حسب الحکم شیخ صاحب کو نکلنا پڑا۔

(۱۶۵) ایک دن کوئی شخص ملاقات کو آئے۔ یہ اُس وقت چند دوستوں کو لیے انگنائی میں کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ شخص مذکور کے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ اور اتفاقاً پاؤں کے آگے ایک مٹی کا ڈھیلا

---

[1] مرزا سلیمان شکوہ اکبر شاہ کے بھائی تھے۔ دلّی چھوڑ کر لکھنؤ جا رہے تھے۔ سرکار لکھنؤ کی بدولت شکوہ و شان سے زندگی بسر کرتے تھے۔ ۱۲

پڑا تھا۔ وہ شغلِ بیکاری کے طور پر جیسے کہ اکثر اشخاص کو عادت ہوتی ہی۔ آہستہ آہستہ لکڑی کی نوک سے ڈھیلے کو توڑنے لگے شیخ صاحب نے نوکر کو آواز دی۔ سامنے حاضر ہوا۔ فرمایا کہ میاں ایک ٹوکری مٹی کے ڈھیلوں کی بھر کر ان کے سامنے رکھ دو کہ دل لگا کر شوق پورا کریں۔

(۱۶۶) شاہ غلام اعظم افضل[1] ان کے شاگرد اکثر حاضر خدمت ہوتے تھے۔ ایک دن آپ تخت پر بیٹھے تھے۔ اس پر سیتل پاٹی کا بوریا بچھا تھا۔ افضل آئے وہ بھی اسی پر بیٹھ گئے اور سیتل پاٹی کا ایک تنکا توڑ کر چٹکی سے توڑنے اور مروڑنے لگے شیخ صاحب نے آدمی کو بلا کر کہا کہ بھائی وہ جو آج نئی جھاڑو تم بازار سے لائے ہو ذرا لے آؤ۔ اُس نے حاضر کی۔ خود لے کر شاہ صاحب کے سامنے رکھ دی اور کہا صاحبزادے! اس سے شغل فرمائیے۔ فقیر کا بوریا آپ کے تھوڑے سے التفات میں برباد ہو جائے گا۔ پھر اور سیتل پاٹی اس شہر میں کہاں ڈھونڈھتا پھرے گا۔ وہ بیچارے شرمندہ ہو کر رہ گئے۔

---

[1] شاہ محمد اجمل کے پوتے شاہ ابوالمعالی تھے۔ ان کے بیٹے شاہ غلام اعظم افضل تخلص ہوتے ۱۲

(۱۶۷) آغا کلب عابد خاں صاحب فرماتے تھے کہ ایک دفعہ شیخ صاحب کے واسطے کسی شخص نے دو تین چمچے بطریق تحفہ بھیجے جو شیشے کے تھے۔ اُن دنوں میں نیا ایجاد سمجھے جاتے تھے اور حقیقت میں بہت خوش نما تھے وہ پہلو میں طاق پر رکھے تھے ایک امیر صاحبزادے آئے۔ اُس طرف دیکھا اور پوچھا کہ حضرت چمچے کہاں سے خریدے اور کس قیمت کو خریدے۔ شیخ صاحب نے حال بیان کیا انہوں نے ہاتھ بڑھا کر ایک چمچہ اُٹھا لیا۔ دیکھ کر تعریف کی۔ پھر باتیں چیتیں کرتے رہے اور چمچے سے زمین پر کھٹکا دے کر شغل بے شغلی فرماتے رہے۔ شیشے کی بساط کیا تھی ٹھیس زیادہ لگی۔ جھٹ سے دو ٹکڑے۔ شیخ صاحب نے دوسرا چمچہ اُٹھا کر سامنے رکھ دیا اور کہا کہ اب اس سے شغل فرمایئے

(۱۶۸) ایک دن اپنے خانہ باغ کے بنگلے میں بیٹھے تھے۔ اور فکرِ مضمون میں غرق تھے۔ ایک شخص آ کر بیٹھے ان کی طبیعت پریشان ہوئی۔ اُٹھ کر ٹہلنے لگے کہ یہ اُٹھ جائیں۔ ناچار پھر آ بیٹھے مگر وہ نہ اُٹھے۔ کسی ضرورت کے بہانے سے پھر گئے کہ سمجھ جائیں وہ پھر بھی نہ سمجھے۔ انہوں نے چلم میں سے چنگاری اُٹھا کر بنگلے کی ٹٹی میں رکھ دی اور آپ لکھنے لگے۔ ٹٹی جلنی شروع ہوئی

وہ شخص گھبرا کر اُٹھے۔ اور کہا کہ شیخ صاحب آپ دیکھتے ہیں؟ یہ کیا ہو رہا ہی۔ انہوں نے اُن کا ہاتھ پکڑ لیا کہ جاتے کہاں ہو۔ اب تو مجھے اور تمھیں جل کر راکھ کا ڈھیر ہونا ہی۔ تم نے میرے مضامین کو خاک میں ملایا ہی میرے دل کو جلا کر خاک کیا ہی اب کیا تمھیں جلنے دوں گا؟

(۱۶۹) اسی طرح ایک شخص نے بیٹھ کر انہیں تنگ کیا نوکر کو بلا کر صندوقچہ منگایا۔ اُس میں سے مکان کے قبالے نکال کر ان کے سامنے دھر دیئے اور نوکر سے کہا کہ بھائی مزدوروں کو بلاؤ اور اسباب اُٹھا کر لے چلو۔ ادھر وہ شخص حیران ان کا مُنہ دیکھے۔ اُدھر نوکر حیران آپ نے کہا دیکھتے کیا ہو۔ مکان پر تو یہ قبضہ کر چکے اب نہ ہو کہ اسباب بھی ہاتھ سے جاتا رہے۔

(۱۷۰) ایک نواب صاحب کے ہاں مشاعرہ تھا وہ ان کے معتقد تھے اُنہوں نے ارادہ کیا کہ شیخ صاحب جب غزل پڑھ چکیں تو اُنھیں سرِ مشاعرہ خلعت دیں۔ یار لوگوں نے خواجہ صاحب[۱] یعنی آتش کے پاس مصرعِ طرح نہ بھیجا۔ اُنہیں اُس وقت مصرع پہنچا جب ایک دن مشاعرہ میں باقی تھا۔ خواجہ صاحب بہت خفا ہوئے اور کہا کہ اب لکھنؤ رہنے کا مقام نہیں۔ ہم نہ رہیں گے۔ شاگرد جمع ہوئے

[۱] خواجہ حیدر علی آتش ۱۲-

اور کہا کہ آپ کچھ خیال نہ فرمائیں۔ نیاز مند حاضر ہیں۔ دس دس شعر کہیں گے
تو صدہا شعر ہو جائیں گے۔ وہ بہت تند مزاج تھے۔ اُن سے بھی ویسی
ہی تقریریں کرتے رہے۔ شہر کے باہر چلے گئے پھرتے پھرتے
ایک مسجد میں جا بیٹھے۔ وہاں سے غزل کہہ کر لائے اور مشاعرے
میں گئے تو ایک قرابین بھی بھر کے لیتے گئے۔ بیٹھے ایسے موقع پر کہ
عین مقابل شیخ صاحب کے تھے۔ اول تو آپ کا انداز ہی بانکے
سپاہیوں کا تھا۔ اس پر قرابین بھری سامنے رکھی تھی اور معلوم
ہوتا تھا کہ خود بھی بھرے بیٹھے ہیں۔ بار بار قرابین اُٹھاتے تھے
اور رکھ دیتے تھے۔ جب شمع سامنے آئی تو سنبھل کر ہو بیٹھے
اور شیخ صاحب کی طرف اشارہ کرکے پڑھا۔

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا * کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

اس ساری غزل میں کہیں ان کے نے پالک ہونے پر کہیں ذخیرۂ
دولت پر کہیں ان کے سامانِ امارت پر غرض کچھ نہ کچھ چوٹ ضرور
ہے۔ شیخ صاحب بیچارے دم بخود بیٹھے رہے۔ نواب صاحب
ڈرے کہ خدا جانے یہ اُن پر قرابین خالی کریں یا میرے پیٹ
میں آگ بھر دیں۔ اسی وقت داروغہ کو اشارہ کیا کہ دو سر خلعت خواجہ
صاحب کے لیے تیار کرو۔ دونوں صاحبوں کو خلعت دے کر رخصت کیا۔

(۱۷۱) اگرچہ انکے کلاموں اور حکایتوں سے معلوم ہوتا ہو کہ طبیعت میں شوخی اور رنگینی نہ تھی۔ مگر شاعری کا وہ نشہ ہی کہ اپنے رنگ پرے ہی آتا ہی۔ چنانچہ میر گھسیٹا نام ایک شخص مر گئے تو شیخ صاحب نے تاریخ فرمائی ؎

جب میر گھسیٹا مر گئے ہائے ✲ ہر ایک نے اپنے مُنہ کو پیٹا

ناسخ نے کہی یہ سُن کے تاریخ ✲ افسوس کہ موت نے گھسیٹا

(۱۷۲) ان کے مزاج میں منصفی اور حق شناسی کا اثر ضرور تھا چنانچہ الہ آباد میں ایک دن مشاعرہ تھا سب موزوں طبع طرحی غزلیں کہہ کر لائے۔ شیخ صاحب نے جو غزل پڑھی مطلع تھا ؎

دل اب تجھ تر سا ہوا چاہتا ہی ✲ یہ کعبہ کلیسا ہوا چاہتا ہی

ایک لڑکے نے صف کے پیچھے سے سر نکالا۔ بھولی بھالی صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ معرکہ میں غزل پڑھتے ہوئے ڈرتا ہی۔ لوگوں کی دل دہی نے اُس کی ہمت باندھی پہلا ہی مطلع تھا ؎

دل اُس بُت پہ شیدا ہوا چاہتا ہی ✲ خدا جانے اب کیا ہوا چاہتا ہی

محفل میں دھوم مچ گئی۔ شیخ ناسخ نے بھی تعریف کرکے لڑکے کا دل بڑھایا اور کہا کہ بھائی یہ فیضانِ الٰہی ہو اس میں استادی کا زور نہیں چلتا تمہارا مطلع مطلعِ آفتاب ہی۔ میں اپنا پہلا مصرع غزل میں سے نکال ڈالوں گا۔

(۱۷۳) آپ شاہ نصیر کا مطلع ہمیشہ پڑھا کرتے تھے اور کہتے تھے نصیر تخلص نہ ہوتا تو یہ مطلع نصیب نہ ہوتا ؎

خیالِ زلفِ دوتا میں نصیر پیٹا کر * گیا ہی سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

(۱۷۴) ایک دن کسی سوداگر کی کوٹھی میں گئے۔ سوداگر بچہ کہ دولتِ حسن کا بھی سرمایہ دار تھا سامنے لیٹا تھا مگر کچھ سوتا کچھ جاگتا تھا آپ نے دیکھ کر فرمایا ع

ہی چشم نیم باز عجب خوابِ ناز ہی"

یہ مصرع تو ہوگیا مگر دوسرا مصرع جیسا جی چاہتا تھا ویسا تم ہوتا تھا گھر آئے اسی فکر میں غرق تھے کہ خواجہ وزیر وزیر آ گئے اُنہوں نے خاموشی کا سبب پوچھا شیخ صاحب نے بیان فرمایا۔ اتفاق ہی کہ اُن کی طبیعت لڑ گئی ؎

ہی چشم نیم باز عجب خوابِ ناز ہی * فتنہ تو سو رہا ہی درِ فتنہ باز ہی

شیخ صاحب بہت خوش ہوئے۔

(۱۷۵) ایک دن بورچی سے خاگینہ کی فرمایش فرمائی تھی۔ اس میں کوئی سنپولیا گرا ہوگا چوں کہ دوبارہ یہ حرکت کی تھی آپ نے تاریخ کہہ دی ؎

جاں بلب آمد ز الہٰ غفلتِ طبّاخ آہ * مے پزد خاگینہ یا مار کرہ اہرمن
چوں دگر بارہ خطا نمود سالِ عیسوی * گفت دل مار سیہ پختا ایں سفیہ اہرمن

(۱۷۶) سنہ ۱۲۳۱ھ میں معتمد الدولہ آغا میر نے جو سوا لاکھ روپیہ قصیدے کا صلہ دیا تھا انہوں نے مرزائی صاحب کے حوالے کر دیا تھا۔ لوگوں نے جانا ان کے گھر ہی میں ہے۔ چور نے رات کو نقب لگائی اور ناکام گیا۔ آپ نے فرمایا۔ تاریخ ؎

دزدے درخانۂ ناسخ چو زدہ نقب امشب * نہ زر و سیم نہ بدمس خجل آمد بیروں

پھر تاریخِ مسیحی چو بریدم سر دزد * دزد از خانۂ مفلس خجل آمد بیروں

(۱۷۷) ایک مشاعرے میں خواجہ صاحب نے مطلع پڑھا ؎

سرمہ منظورِ نظر ٹھیرا ہی چشمِ یار میں * نیل کا گنڈا پہنایا مردمِ بیمار میں

شیخ صاحب نے کہا سبحان اللہ خواجہ صاحب کیا خوب فرمایا ہے ؎

سرمہ منظورِ نظر ٹھیرا جو چشمِ یار میں * نیلگوں گنڈا پہنایا مردمِ بیمار میں

خواجہ صاحب نے اٹھ کر سلام کیا اور کہا جائے استاد خالیست"

(۱۷۸) ناسخ ایک مشاعرے میں ایسے وقت پہنچے کہ جلسہ ختم ہو چکا تھا مگر خواجہ حیدر علی آتش وغیرہ چند شعرا بھی موجود تھے۔ یہ جا کر بیٹھے تعظیم رہی اور مزاج پرسی کے بعد کہا کہ جناب خواجہ صاحب مشاعرہ ہو چکا۔ انہوں نے کہا کہ سب کو آپ کا اشتیاق تھا شیخ صاحب نے یہ مطلع پڑھا ؎

جو خاص ہیں وہ شریکِ گروہِ عام نہیں * شمار دانۂ تسبیح میں امام نہیں

چوں کہ نام بھی امام بخش تھا اس لیے تمام اہلِ جلسہ نے نہایت تعریف کی۔ خواجہ صاحب نے یہ مطلع پڑھا ؎

یہ بزم وہ ہے کہ لاخیر کا مقام نہیں ٭ ہمارے گنجفہ میں بازیِ غلام نہیں

بعض اشخاص کی روایت ہے کہ یہ مطلع آتش کے شاگرد کا ہے۔ ناسخ کے شاگردوں کی طرف سے اُس کا جواب ہے اور حقیقت یہ ہے کہ لاجواب ہے ؎

جو خاص بندے ہیں وہ بندۂ عوام نہیں ٭ ہزار بار جو یوسف بکے غلام نہیں

عوام میں یہ روایت اس طرح مشہور ہے۔ مگر دیرینہ سال لوگ جو اُس زمانے کی صحبتوں میں شریک تھے اُن سے یہ تحقیق ہوا کہ پہلا مطلع آتش نے حقیقت میں طالب علی خاں عیشی کے حق میں کہا تھا۔ یار لوگوں نے صفتِ مشترک پیدا کر کے شیخ صاحب کے ذمہ لگا دیا۔

(۱۷۹) **شیخ ناسخ** ایک دن نواب نصیر الدین حیدر کے حضور میں حاضر تھے۔ حقہ سامنے تھا۔ فرمایا کہ شیخ صاحب! اس پر کچھ کہیے۔ اُنھوں نے اُسی وقت کہا ؎

حقہ جو ہے حضورِ معلّٰی کے ہاتھ میں ٭ گویا کہ کہکشاں ہے ثریا کے ہاتھ میں

ناسخ یہ سب بجا ہے ولیکن تو عرض کر ٭ بے جان بولتا ہے مسیحا کے ہاتھ میں

(۱۸۰) مرزا حاجی صاحب جن کے پاس شیخ صاحب کے روپیے امانت رہے تھے۔ ایک امیر شرفائے لکھنؤ میں سے تھے۔ اور شیخ صاحب

کے بہت دوست تھے۔ اُنھوں نے ایک عمدہ فیروزہ پر آپ کا نام نامی کھدوا کر انگوٹھی بنوا کر دیا۔ اکثر پہنے رہتے تھے کبھی اُتار کر رکھ بھی دیتے تھے وہ کسی نے چرالی یا کھوئی گئی اُس پر فرمایا ؎

ہم سا کوئی گمنام زمانے میں نہ ہوگا ٭ گم ہو وہ نگیں جس پہ کھُدے نام ہمارا

(۱۸۱) میر انیسؔ مرحوم فرماتے تھے کہ والد[1] میرے گھر میں تشریف رکھتے تھے میں ایک مرثیہ میں وہ روایت نظم کر رہا تھا کہ جناب امام حسینؑ عالمِ طفولیت میں سواری کے لیئے ضد کر رہے تھے جناب آنحضرتؐ تشریف لائے اور فرطِ شفقت سے خود جھک گئے

[1] میر مستحسن خلیق نام تھا جو میر حسن کے صاحبزادے تھے اور میر حسن صاحب کا مختصر حال یہ ہے حسن تخلص میر حسن نام۔ خاص دلّی کے تھے۔ پُرانی دلّی میں سید واڑہ ایک محلّہ تھا۔ وہاں پیدا ہوئے تھے۔ عالمِ شباب میں والد کے ساتھ فیض آباد گئے اس زمانے میں فیض آباد حاکم نشین شہر تھا۔ لکھنؤ ایک قصبہ تھا۔ آصف الدولہ مرحوم کو اس کے آباد کرنے کا شوق ہوا زیادہ تر یہاں رہنے لگے۔ اُن کے سبب سے امرا کو بھی یہیں رہنا پڑا اور عمارات کا تعمیر کرنا واجب ہوا مگر دو گھر تھے ایک قدم یہاں رہتا تھا ایک قدم وہاں۔ فیض آباد جا کر سرفراز جنگ خلف نواب سالار جنگ کی سرکار میں نوکر ہوگئے کچھ مدت مقام مذکور میں رہ کے پھر لکھنؤ آگئے۔ مثنوی بدر منیر انہیں کی تصنیف ہے عشرۂ محرم سنہ ۱۲۰۱ھ کو عالمِ فانی سے عالمِ جاودانی کو رحلت کی مفتی گنج میں نواب قاسم علی خاں کے باغ کے پچھواڑے دفن ہیں۔ عمر کا ٹھیک پتہ نہیں لیکن پچاس برس سے سن تجاوز رہی تھا۔ ۱۲

کہ آؤ سوار ہو جاؤ تاکہ پیارے نولسے کا دل آزردہ نہ ہو۔ اس موقع پر
ٹیپ کا دوسرا مصرع کہہ لیا تھا ع "اچھا سوار ہو جیسے ہم اونٹ بنتے ہیں"
پہلے مصرع کے لیے اُلٹ پلٹ کرتا تھا۔ جیسا کہ دل چاہتا تھا ویسا
ویسا برجستہ نہ بیٹھتا تھا۔ والد نے مجھے غور میں غرق دیکھ کر پوچھا
کیا سوچ رہے ہو؟ میں نے مضمون بیان کیا اور جو مصرعے خیال
میں آئے تھے۔ پڑھے۔ فرمایا یہ مصرع لگا دو (ذرا زبان کی لطافت
کو تو دیکھو۔) جب آپ روٹھتے ہیں تو خشکل سے منتے ہیں۔ اچھا سوار ہو جیسے ہم اونٹ بنتے ہیں

(۱۸۲) خواجہ حیدر علی آتش[1] شیخ امام بخش ناسخ کے ہمعصر تھے۔ شاعر
تھے اور گھر بیٹھے روز مقابلے رہتے تھے۔ دونوں کے معتقد کہ انبوہ
در انبوہ تھے۔ جلسوں کو معرکے اور معرکوں کو ہنگامے بناتے تھے۔
مگر دونوں بزرگوں پر صد رحمت ہو کہ مرزا رفیع اور سید انشا کی طرح

---

[1] خواجہ حیدر علی نام۔ آتش تخلص۔ باپ دلی کے رہنے والے تھے لکھنؤ میں جاکے سکونت اختیار کی
اپنے زمانے کے مسلم الثبوت استاد تھے کچھ رنگ فقیری کا بھی تھا۔ ساتھ اس کے بڑھاپے تک تلوار باندھ کر
سپاہیانہ بانکپن کو نباہے جاتے تھے۔ سر پر ایک لٹ کبھی حیدری چتا کہ یہ بھی محمد شاہی بانکوں کا
سکہ تھا اسی میں ایک طرہ سبزی کا لگائے رہتے تھے اور بے تکلفانہ رہتے تھے ۱۲۶۳ھ میں ایک دن
بھلے چنگے بیٹھے تھے یکایک ایسا موت کا جھونکا آیا کہ شعلہ کی طرح بجھ کر رہ گئے آتش کے گھر میں سوائے
راکھ کے ڈھیر کے اور کیا ہوتا۔ میر علی اوسط رشک نے تاریخ لکھی ع "خواجہ حیدر علی ای وا مرد ند" ۱۲

دست و گریبان نہ ہوتے تھے۔ کبھی کبھی نوک جھونک کی ہو جاتی تھی کہ وہ قابلِ اعتبار نہیں۔ چنانچہ خواجہ صاحب نے جب شیخ صاحب کی غزلوں پر متواتر غزلیں لکھیں تو انھوں نے کہا ؎

ایک جاہل کہہ رہا ہے میرے دیوان کا جواب * بو مسیلم نے لکھا تھا جیسے قرآں کا جواب
کیوں نہ دے ہر مومن اُس ملحد کے دیواں کا جواب * جس نے دیواں اپنا ٹھیرایا ہے قرآں کا جواب
(شیخ صاحب) (خواجہ صاحب)

(۱۸۳) شیخ امام بخش ناسخ صاحب کے معتقد خواجہ صاحب کے بعض الفاظ پر بھی گفتگو کرتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ جب انھوں نے یہ شعر پڑھا ؎

دختر رز مری مونس ہے مری ہمدم ہے * میں جہانگیر ہوں نور جہاں بیگم ہے

لوگوں نے کہا کہ حضور! بیگم ترکی لفظ ہے اہلِ زبان گاف پر پیش بولتے ہیں اور زبان فارسی کا قاعدہ بھی یہی چاہتا ہے۔ یہ اُس وقت بھنگ پئے ہوئے بیٹھے تھے کہا کہ ہُو تھم ہم ترکی نہیں بولتے ترکی بولیں گے تو بیگم کہیں گے۔

اسی طرح جب انھوں نے یہ مصرع کہا ع

"اُس خوان کی نمش کفِ مار سیاہ ہے"

لوگوں نے کہا کہ قبلہ! یہ لفظ فارسی اور اصل میں نمشک ہے انھوں نے کہا کہ جب فارس میں جائیں گے تو ہم بھی نمشک کہیں گے۔ یہاں سب نمش کہتے ہیں تو نمش ہی شعر میں باندھنا چاہیے ؎

پیشگی دل کو جوڑے ہے۔ وہ اسے تجھیلے ٭ ساری سرکار روشنی ہی عشق کی سرکار جُدا
حریفوں نے کہا کہ پیشگی ترکیب فارسی ہے۔ مگر فارسی والوں کے
استعمال میں نہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ ہمارا محاورہ ہی۔

(۱۴۴) ایک شاگرد اکثر بے روزگاری کی شکایت سے سفر کا ارادہ
ظاہر کیا کرتے تھے اور خواجہ صاحب اپنی آزادہ مزاجی سے کہا
کرتے تھے کہ میاں کہاں جاؤ گے! دو گھڑی مل بیٹھنے کو غنیمت
سمجھو اور جو خدا دیتا ہی اُس پر صبر کرو۔ ایک دن وہ آئے اور
کہا کہ حضرت! رخصت کو آیا ہوں۔ فرمایا خیر باشد کہاں؟ اُنھوں
نے کہا کل بنارس کو روانہ ہوں گا کچھ فرمائش ہو تو فرما دیجئے آپ
ہنس کر بولے اتنا کام کرنا کہ وہاں کے خدا کو ذرا ہمارا بھی سلام
کہہ دینا۔ وہ حیران ہو کر بولے کہ حضرت! یہاں اور وہاں کا خدا
کوئی جُدا ہی؟ فرمایا کہ شاید یہاں کا خدا بخیل ہو وہاں کا کچھ سخی ہو
اُنھوں نے کہا معاذ اللہ آپ کے فرمانے کی یہ بات ہی؟ خواجہ صاحب
نے کہا بھلا سنو تو سہی جب خدا وہاں یہاں ایک ہی تو پھر ہمیں
کیوں چھوڑتے ہو جس طرح اس سے وہاں جا کر مانگو گے
اُسی طرح یہاں مانگو۔ جو وہاں دے گا یہاں بھی دے گا۔ اس
بات نے اُن کے دل پر ایسا اثر کیا کہ سفر کا ارادہ موقوف کیا

اور خاطر جمع سے بیٹھ گئے۔

(۱۸۵) خواجہ صاحب کی سیدھی سادی طبیعت اور بھولی بھالی باتوں کے ذکر میں میر انیس مرحوم نے فرمایا کہ ایک دن آپ کو نماز کا خیال آگیا۔ کسی شاگرد سے کہا کہ بھئی ہمیں نماز تو سکھاؤ۔ وہ اتفاقاً فرقۂ سُنّت جماعت سے تھا۔ اُس نے ویسی ہی نماز سکھا دی اور یہ کہہ دیا کہ اُستاد! عبادتِ الٰہی جتنی پوشیدہ ہو اُتنی ہی اچھی ہوتی ہے۔ جب نماز کا وقت ہوتا یہ حجرہ میں جاتے یا گھر کا دروازہ بند کر کے اُسی طرح نماز پڑھا کرتے۔

میر دوست علی خلیل ان کے شاگردِ خاص اور خلوت و جلوت کے حاضر باش تھے۔ ایک دن اُنھوں نے بھی دیکھ لیا۔ بہت حیران ہوئے یہ نماز پڑھ چکے تو اُنھوں نے کہا کہ اُستاد! آپ کا مذہب کیا ہے؟ فرمایا شیعہ ہیں! کیا پوچھتے ہو؟ اُنھوں نے کہا کہ نماز سُنّیوں کی ہے؟ فرمایا کہ بھئی میں کیا جانوں۔ فلاں شخص سے میں نے کہا تھا۔ اُس نے جو سکھا دی سو پڑھتا ہوں۔ مجھے کیا خبر کہ ایک خدا کی دو دو نمازیں ہیں۔ اُس دن سے شیعوں کی طرح نماز پڑھنے لگے۔

(۱۸۶) افسوس ہے کہ اس موقع پر بعض جہلا نے جن سے کوئی زمانہ

اور کوئی جگہ خالی نہیں اپنی یادہ گوئی سے اہلِ لکھنؤ کی عالی ہمتی اور مہماں نوازی کو داغ لگایا چنانچہ ایک معرکے کے مشاعرے میں شاہ[1] صاحب نے آٹھ غزلیں فرمائش کی کہہ پڑھی تھیں۔ ایک غزل اپنی طرح کی ہوئی بھی پڑھی جس کی ردیف و قافیہ غسل کی مکھی تھا، اور محل کی مکھی تھا۔ اس پر بعض اشخاص نے طنز کی۔ کسی شعر پر کہا کہ سبحان اللہ کیا خوب مکھی بیٹھی ہے۔ کسی نے کہا کہ حضور! یہ مکھی تو نہ بیٹھی۔ ایک شخص نے یہ بھی کہا کہ قبلہ! غزل تو خوب ہے مگر ردیف سے جی متلانے لگا۔ شاہ صاحب نے اُسی وقت کہا کہ جنہیں چاشنیِ سخن کا مذاق ہے وہ تو لطف ہی اُٹھاتے ہیں۔ ہاں جنہیں صفرائے حسد کا زور ہے اُن کا جی متلائے گا۔

---

[1] شاہ نصیرالدین نام نصیر تخلص، رنگ چوں کہ سیاہ فام تھے میاں کلّو کے نام سے مشہور تھے اور یہ بزرگوں کے نام چند گاؤں دربارِ شاہی سے آل تمغا معاف تھے۔ راجہ چندو لال کے زمانے میں آپ دکن بھی گئے تھے لیکن دلّی کا چٹخارا کبھی ایسا نہیں کہ انسان بھول جاتے اس لئے انعام و اکرام سے مالا مال ہو کر پھر دلّی آئے اور تین دفعہ پھر گئے۔ دو مرتبہ لکھنؤ بھی گئے۔ چوتھی مرتبہ دکن کا جانا آخری تھا وہیں حیدرآباد میں زمین کا پیوند ہوئے اور قاضی مخدوم موسیٰ کی خانقاہ میں مدفون ہیں۔ "چراغِ گل" تاریخِ وفات ہے۔ ۱۲
۱۲۵۴ھ

(۱۸۷) حکیم قدرت اللہ خاں قاسم سے ایک خاص معاملہ یہ درمیان آیا کہ ایک دفعہ مشاعرے میں طرح ہوئی۔ یارِ شتاب اور تلوار شتاب۔ شاہ نصیر نے جو غزل کہہ کر پڑھی تو اس میں قطعہ تھا۔

رُخِ انور کا ترے وصف لکھا جب ہم نے * انوری نے دیا دیوان اُلٹ بارِ شتاب
پھر پڑھا ہم نے جو مضمونِ بیاضِ گردن * سن کے ہو گیا چپ قاسمِ انورِ شتاب

حکیم صاحب مرحوم خاص و عام میں واجب التعظیم تھے۔ اس کے علاوہ فضیلت علمی کے ساتھ فن شعر کے مشاق تھے۔ اور فقط موزونیِ طبع اور زورِ کلام کو خاطر میں نہ لاتے۔ چونکہ خود قاسم تخلص کرتے تھے۔ اس لیے قاسمِ انور کا لفظ ناگوار ہوا چنانچہ دوسرے مشاعرے کی غزل میں قطعہ لکھا ۔

واسطے انساں کے انسانیت اوّل شرط ہے * میر ہو یا میرزا ہو خاں ہو یا نوّاب ہو
آدمی تو کیا خدا کو بھی نہ ہم سجدہ کریں * گر نہ خم تعظیم کو پہلے سرِ محراب ہو

(۱۸۸) شاہ صاحب باوجودیکہ اس قدر صاحبِ کمال تھے اور محفلوں میں اعزاز و اکرام کے صدر نشین تھے۔ اس پر نہایت خوش مزاج اور یار باش تھے۔ بوڑھوں میں بوڑھے بچوں میں بچے بن جاتے تھے۔ ہر ایک میلے میں جا کر تلاشِ مضامین کرتے تھے اور شگفتگیِ سخن سے جو دل کملا جاتا ہے اُسے تر و تازہ اور شاداب کرتے تھے۔

ذوقِ مرحوم فرماتے تھے کہ ایک دفعہ بھولو شاہ کی بسنت میں شاہ صاحب آئے۔ چند شاگرد ساتھ تھے اُنہیں لے کر تین ہزاری باغ کی دیوار پہ بیٹھے تماشا دیکھنے لگے کسی رنڈی نے بہت سا روپیہ لگا کر نہایت زرق برق کے ساتھ ایک کارچوبی رتھ بنوائی تھی شہر میں جا بجا اُس کا چرچا ہو رہا تھا۔ رنڈی رتھ میں بیٹھی چھم چھم کرتی سامنے سے نکلی۔ ایک شاگرد نے کہا کہ اُستاد اس پر کوئی شعر ہو۔ اُسی وقت فرمایا ؎

اُس کی رتھ کا کلس طلائی دیکھ * شب کہا ماہ سے یہ پروین نے
پھر پروانہ یہ نکالی ہاے * جو بچہ بیضہ سے مرغِ زریں نے

(۱۸۹) ایک ایسے ہی موقع پر کوئی رنڈی سامنے سے نکلی اُس کے سر پر اودی رضائی تھی اور وسمہ کی چمک عجیب لطف دکھاتی تھی ایک شاگرد نے شعر فرمائش کی۔ اُنہوں نے فرمایا ؎

اُودی وسمہ کی نہیں تیری رضائی سر پر * جیسے رات ہو تاروں بھری چھلکی سر پر

(۱۹۰) شاہ نظام الدین کی سترھویں میں گئے۔ میر باقر علی صاحب ایک سید خاندانی دلی کے تھے شہر سے درگاہ کو چلے راہ میں کسی نے مار ڈالا۔ درگاہ میں خبر پہنچی تو اُن کی جوانی اور مرگِ ناگہانی پر سب نے افسوس کیا۔ شاہ صاحب نے اُسی وقت تاریخ کہی۔ کیا ہے عدیل

تخرجہ ہی۔ قطعۂ تاریخ ؎

بہ شبِ عرسِ حضرتِ محبوب * میر باقر علی چو گشت شہید
بے تشویش گفتم ایں تاریخ * ہر کہ او را بکشت بود یزید

(۱۹۱) دلّی میں ایک منشی ہندو تھے نچیا نام رنڈی پر مسلمان ہوگئے۔ شاہ صاحب نے فرمایا ؎

جس طرف تو نے کیا ایک اشارہ نچیا * سچ یہ ہے آہ تری چشم کا مارا نہ جیا

(۱۹۲) عیسیٰ خاں اور موسیٰ خاں دو بھائی دلّی میں تھے۔ مال و دولت کی بابت دونوں میں کچھ جھگڑا ہوا عیسیٰ خاں ناکام ہوئے موسیٰ خاں نے کچھ عدالت کے زور سے کچھ حکمتِ عملی سے سارا مال مار لیا۔ شاہ صاحب نے بطورِ ظرافت چند شعر کا قطعہ کہا۔ ایک مصرع یاد ہے اور وہی قطعہ کی جان ہے ع

"ہوئی آفاق میں شہرت کہ عیسیٰ خاں کا گھر موسا"

(۱۹۳) مرزا مغل بیگ نے خدمتِ وزارت میں نوکرانِ شاہی کو ناخوش کیا۔ اس موقع پہ ہر ایک شخص نے اپنے اپنے حوصلے کے بموجب دل کا بخار نکالا ایک صاحب نے تاریخ کہی ؎

ہنس کے ہاتف نے کہا یہ تیغ کہ واہ * کیا ہی الٹی میں وزارت آگئی

شاہ صاحب نے بھی ایک قطعہ کہا اس کے دو شعر یاد ہیں ؎

تانے بانے پر نہ کر دُنیا کے ہرگز اعتبار* غور کر چشمِ حقیقت سے کہ سر پر کوچ ہے
توڑ کر تو اِس طرف سے اُس طرف کو جوڑ لے * تُو تو مومن ہے وگرنہ مومنوں کی بیچ ہے

(۲۱۹) دکن کی سرکار میں دستور تھا کہ دن رات برابر کاروبار جاری رہتے تھے۔ مختلف کاموں کے وقت مقرر تھے۔ جس صیغہ کا دربار ہو چکا اُس کے متعلق لوگ رخصت ہوئے دوسرے صیغہ کے آن حاضر ہوئے۔ اسی میں صاحبِ دربار نے اُٹھ کر ذرا آرام لے لیا ضروریات سے فارغ ہوئے اور پھر آن بیٹھے۔ چنانچہ مشاعرہ اور مناظرہ کا دربار رات کے پچھلے پہر ہوتا تھا۔ ایک موقع پر کہ نہایت دھوم دھام کا جلسہ تھا۔ تمام باکمال اہلِ دکن اور اکثر اہلِ ایران موجود تھے۔ سب کی طبیعتوں نے اپنے اپنے جوہر دکھائے۔ خصوصاً چند شعرائے ایران نے ایسے ایسے قصاید سُنائے کہ لبِ دہن پر حرفِ آفریں نہ چھوڑا۔ شاہ نصیر کی حُسنِ رسائی اور اخلاق نے دربار کے چھوٹے بڑے سب تسخیر کیئے ہوتے تھے چنانچہ جب شمع قریب پہنچی تو ایک خواص نے کہ سونے کا عصا ہاتھ میں ہزار بارہ سو روپیہ کا دوشالہ کندھے پر ڈالے کھڑا تھا کان میں جھک کر کہا کہ آج آپ غزل نہ پڑھیں تو بہتر ہے آپ وہیں بگڑ کر بولے کہ کیوں؟ اُس نے کہا کہ ہوا تیز ہو گئی (یعنی کلام

کا سرسبز ہونا مشکل ہی) یہ خفگی سے ٹھوڑی پر ہاتھ پھیر کر بولے کہ ایسا تو میں خوب صورت بھی نہیں کہ کوئی صورت دیکھنے کو نوکر رکھے گا۔ یہ نہیں تو پھر میں ہوں کس کام کا۔ اس قیل وقال میں شمع بھی سامنے آگئی۔ پھر جو غزل سُنائی تو سب کو لُٹا دیا۔

(۱۹۵) قطعِ نظر اس سے کہ شعر کے باب میں طبع حاضر رکھتے تھے حاضر جوابی میں برق تھے۔ چنانچہ ایک دن سلطان جی کی سترھویں میں گئے۔ اور باؤلی میں جاکر ایک طاق میں بیٹھ گئے۔ حقّہ پی رہے تھے کہ اتّفاقاً ایک نواب صاحب آنکلے۔ شاہ صاحب سے صاحب سلامت ہوئی۔ وہیں بہت سی اربابِ نشاط بھی حاضر تھیں اور ناچ ہو رہا تھا۔ اُس عالمِ زرق برق پر اشارہ کر کے نواب صاحب نے فرمایا کہ اُستاد! آج آپ بھی بالائے طاق ہیں۔ بولے جی ہاں جفت ہونے کو بیٹھا ہوں آپ تشریف لائیے۔

(۱۹۶) ایک دفعہ دکن کو چلے۔ نواب جھجر مدّت سے بُلاتے تھے اب چوں کہ مقام مذکور سرِ راہ تھا اور گرمی شدّت سے پڑتی تھی۔ برابر سفر بھی مشکل تھا۔ اس لیئے وہاں گئے اور کئی دن مقام کیا۔ جب چلنے لگے تو رخصت کی ملاقات کو گئے۔ نواب نے کہا کہ گرمی کے دن ہیں۔ دکن کا سفر دور دراز کا سفر ہی۔ خدا بھر خیر و عافیت

سے لاتے ہیں۔ مگر یہ عمدہ فرماتے کہ اب جھجر میں کب آئیے گا۔ ہنس کر جواب دیتے کہ جھجر کی چاہ تو وہی گرمی ہیں۔

(۱۹۷) ذہانت جاگیر کے تعلّق سے ایک دفعہ تحصیلدار سونی پت کے پاس ملاقات کو گئے۔ اور کچھ رنگترے دلّی سے بطورِ سوغات ساتھ لیے گئے۔ تحصیلدار نے کہا کہ جناب شاہ صاحب! رنگتروں کی تکلیف کیا ضرور تھی۔ آپ کی طرف سے بڑا تحفہ آپ کا کلام ہے۔ ان رنگتروں کی حُسن تشبیہ میں کوئی شعر ارشاد فرمائیے اُسی وقت رباعی کہی اور سُنائی ؎

اے نیّرِ برجِ آسمانِ اقبال ٭ ان رنگتروں پہ غور سے کیجیے گا خیال

یہ نذرِ حقیر ہو قبولِ خاطر ٭ پردہ میں شفق کے ہیں گرہ بند ہلال

(۱۹۸) مومن خاں[لہ] کی عالی دماغی اور بلند خیالی شعرائے متقدمین

لہ مومن خاں نام، مومن تخلّص۔ ان کے والد کا نام حکیم غلام نبی خاں ولد حکیم نامدار خاں شرفائے شہر میں سے تھے۔ کشمیری الاصل ہیں۔ اول حکیم نامدار خاں اور حکیم کامدار خاں دو بھائی سلطنتِ مغلیہ کے آخری دور میں آکر شاہی طبیبوں میں شامل ہوئے۔ شاہ عالم کے زمانے میں موضع بلابہ پرگنہ نارنول جاگیر تھی۔ جب سرکار انگریزی نے جھجر کی ریاست نواب فیض طلب خاں کو عطا فرمائی تو پرگنہ نارنول بھی اُس میں شامل تھا۔ رئیس مذکور نے ان کی جاگیر ضبط کر کے ہزار روپیہ سالانہ پنشن ورثہ حکیم نامدار خاں (بقیہ نوٹ بر صفحہ آئندہ)

متاخرین میں سے کسی کی فصاحت یا بلاغت کو خاطر میں لاتے تھے یہ قول اُن کا مشہور تھا کہ گلستانِ سعدی کی تعریف میں لوگوں کے دم چڑھے جاتے ہیں۔ اس میں ہے کیا؟ گفت گفت۔ گفتہ اند گفتہ اند۔ کہتا چلا جاتا ہے۔ اگر ان لفظوں کو کاٹ دو تو کچھ بھی نہیں رہتا

(بقیہ نوٹ صفحۂ گذشتہ) کے نام مقرر کر دی اُس میں سے اِن کو بھی حصّہ ملتا تھا اس کے علاوہ ان کے خاندان کے چار طبیبوں کے نام سوسو روپیہ پنشن سرکار انگریزی سے بھی ملتی تھی۔ اُس میں سے ان کو بھی حصّہ ملتا رہا۔ ولادت دہلی میں ۱۲۱۵ھ چیلوں کے کوچے میں رہتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کا مدرسہ وہاں سے بہت قریب تھا۔ ان کے والد کو شاہ صاحب سے کمال عقیدت تھی۔ جب یہ پیدا ہوئے تو حضرت ہی نے آکر کان میں اذان دی اور مومن خاں نام رکھّا۔ گھر والوں نے اس نام کو ناپسند کیا اور حبیب اللہ نام رکھنا چاہا لیکن شاہ صاحب ہی کے نام سے نام پایا۔ خاں صاحب پانچ دفعہ دلّی سے باہر گئے اوّل رام پور۔ اور وہاں جا کر کہا ؎ دلّی سے رام پور میں لایا جنوں کا شوق * ویرانہ چھوڑ آئے ہیں ویرانہ تر میں ہم دوسری دفعہ سہسوان گئے وہاں فرماتے ہیں:۔ ؎

چھوڑ دلّی کو سہسوان آیا * ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں میں

پھر جہانگیر آباد میں نواب مصطفیٰ خاں کے ساتھ کئی دفعہ گئے ایک دفعہ نواب شائستہ خاں کے ساتھ سہارن پور گئے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دلّی میں جو میسّر تھا اُسی پر قانع تھے۔ خاں صاحب کو علم نجوم میں بھی بڑا دخل تھا۔ کوٹھے پر سے گرنے کے بعد حکم لگایا تھا کہ پانچ دن (بقیہ نوٹ بر صفحہ آئندہ)

ایک دن مفتی صدر الدین خاں مرحوم کے مکان پر یہی تقریر کی۔ مولوی احمد الدین کرسانوالہ۔ مولوی فضلِ حق صاحب کے شاگرد بیٹھے تھے اُنھوں نے کہا کہ قرآن شریف میں کیا فصاحت ہے۔ جا بجا قال قال قالوا قالوا ہے۔

(۱۹۹) ایک اور شخص نے الٰہی بخش کا سجع لکھا تھا ع "مجھ گنہگار کو الٰہی بخش"۔ خاں صاحب نے فرمایا ع میں گنہگار ہوں الٰہی بخش۔

تاریخیں۔ تاریخ میں ہمیشہ تعمیہ اور تخرجہ معیوب سمجھا جاتا ہے مگر ان کی طبع رسانی اسے محسنات تاریخ میں داخل کر دیا۔ چنانچہ اپنے والد کی تاریخ وفات کہی ؎

بہ من الہام گشت سالِ وفات ٭ کہ غلام نبی بہ حق پیوست

غلام نبی کے اعداد بہرِ خاک یعنی خ کے ساتھ ملانے سے ۱۲۶۳ھ ہوتے ہیں۔

تاریخ چاہ ع آب لذّت فزا انجام بگیر + آب لذّت فزا کے اعداد چاہ کے اعداد میں ڈالو تو ۱۲۶۵ھ حاصل ہوئے۔

(بقیہ نوٹ صفحۂ گزشتہ) یا پانچ مہینے یا پانچ برس میں مر جاؤں گا۔ چنانچہ پانچ مہینے کے بعد گرنے کی تاریخ خود ہی کہی "دست و بازو بہ شکست"، مرنے کی تاریخ "ماتمِ مومن خاں ہے" ۱۲۶۷ھ نئی دروازے کے باہر مہندیوں میں شاہ عبد العزیز خاں کے خاندان کے پاس مدفون ہیں ۱۲۰

ایک شخص زین خاں نام حج کو گیا۔ رستے ہیں سے پھر آیا
خاں صاحب نے کہا ع چوں بیاید ہنوز خر باشد سنہ ۱۲۵۶ھ

شاہ محمد اسحاق صاحب نے دلّی سے ہجرت کی۔ خاں صاحب نے کہا سہ

گفتیم وحید عصر اسحاق ٭ بر حکم شہنشہ دو عالم
بگذاشتہ دار حرب امسال ٭ جا کردہ بمکۂ معظم

وحید عصر اسحاق کے اعداد مکۂ معظم کے اعداد کے ساتھ ملاؤ۔ اور دارِ حرب کے اعداد اس میں سے تفریق کرو تو سنہ ۱۲۵۷ھ ہجری تاریخ ہجرت نکلتی ہے۔

ایک شخص قلعۂ دلّی سے نکالا گیا۔ انہوں نے تاریخ کہی ع
از باغِ خلد بیروں شیطانِ بیحیا شد ٭ باغ خلد کے اعداد میں سے شیطانِ بیحیا کے عدد نکال ڈالیں تو سنہ ۱۲۳۲ھ رہتے ہیں۔

سادی تاریخیں بھی عمدہ ہیں۔ چنانچہ خلیل خاں کے ختنہ کی تاریخ کہی۔ سُنّتِ خلیل اللہ۔ اپنی عمہ کے مرنے کی تاریخ کہی لہا اجر عظیم
اپنے والد کی وفات کی تاریخ کہی :۔ قَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِیْمًا۔
اپنی بیٹی کی ولادت کی تاریخ کہی :۔

ناں کٹنے کے ساتھ ہاتف نے ٭ کہی تاریخ دخترِ مومن

دخترِ مومن کے اعداد میں سے ناں کے اعداد کو اخراج کیا ہے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب کی وفات کی تاریخ :-

دستِ بے دادِ اجل سے بے سروپا ہوگئے * فقر و دیں فضل و ہنر لطف و کرم علم و عمل
الفاظ مصرعِ آخر کے اوّل و آخر کے حرفوں کو گرا دو۔ بیچ کے حرفوں کے
عدد لے لو تو ۱۲۳۹ھ رہتے ہیں۔

ان کے معمے بھی متعدد ہیں۔ مگر ایک لاجواب ہی۔ ایسا نہیں سُنا گیا ؂
سنے کیوں کر کہ ہو سب کا راُلٹا * ہم اُلٹے۔ بات اُلٹی۔ یار اُلٹا یعنی مہتاب رائے
پہیلیاں بھی کہیں۔ ایک یہاں لکھی جاتی ہو کہ گھڑیال پر ہے۔

نہ بولے جب تک کہ کوئی بلائے * نہ لفظ اور معنی سمجھ میں کچھ آئے
نہیں چھوڑ پردہ لٹکتا رہے * زمانے کا احوال بکتا رہے
شب و روز غوغا مچایا کرے * اسی طرح سے مار کھایا کرے

(۳۰۰) شاگردانِ الٰہی کی طبیعت بھی جذبۂ الٰہی کا جوش رکھتی ہو بچپن سے دل چونچال تھا۔ ابتدائے مشق میں کسی لفظ پر اُستاد (میر مظفر حسین ضمیر) کی اصلاح مرزا دبیر[1] کے پسند نہ آئی۔ شیخ ناسخ زندہ تھے۔ مگر

[1] مرزا سلامت علی صاحب دبیر تخلّص، لکھنؤ کے مشہور مرثیہ گو مرزا آغا جان کے صاحبزادے تھے۔ خاندانی شاعر نہ تھے۔ میر مظفر حسین ضمیر کے شاگرد ہوئے اور جو کچھ استاد سے پایا بہت بلند اور روشن کرکے دکھایا۔ ان کی سلامت روی، پرہیزگاری، مسافر نوازی، سخاوت نے صفتِ کمال کو زیادہ تر رونق دی تھی۔ شوکتِ الفاظ۔ (بقیہ نوٹ بر صفحہ آئندہ)

بوڑھے ہو گئے تھے۔ اُن کے پاس چلے گئے، وہ اُس وقت گھر کے صحن میں مونڈھے بچھائے جلسہ جمائے بیٹھے تھے۔ اُنھوں نے عرض کی کہ حضرت! اس شعر میں میں نے تو یہ کہا ہے اور اُستاد نے یہ اصلاح دی ہے۔ اُنھوں نے فرمایا کہ اُستاد نے ٹھیک اصلاح دی ہے۔ اُنھوں نے پھر کہا کہ حضرت کتابوں میں تو اس طرح آیا ہے اُنھوں نے کہا کہ نہیں جو تمہارے اُستاد نے بنایا ہے وہی درست ہے۔ اُنھوں نے پھر عرض کی کہ حضرت آپ کتاب کو ملاحظہ فرمائیں۔ شیخ صاحب نے جھنجھلا کر کہا ارے تُو کتاب کو کیا جانے! ہمارے سامنے کتاب کا نام لیتا ہے! ہم کتابیں دیکھتے دیکھتے خود کتاب بن گئے ہیں۔ ایسے غصّے ہوئے کہ لکڑی سامنے رکھی تھی وہ لے کر اُٹھے یہ بھاگے۔ اُنھیں بھی

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) مضامین کی آمد جابجا غم انگیز اشارے، دردخیز کنائے المناک اور دل گداز انداز، جو مرثیہ کی غرض اصلی ہے، ان وضعوں کے بادشاہ ہیں ۲۹ محرم سنہ ۱۲۹۲ھ کو (۷۲) برس کی عمر میں انتقال کیا۔ اس مدّت میں کم سے کم تین ہزار مرثیے لکھے ہوں گے سلاموں اور نوحوں اور رباعیوں کا کچھ شمار نہیں۔ ان کے ساتھ ہندوستان میں مرثیہ گوئی کا خاتمہ ہو گیا۔ نہ اب ایسا زمانہ آئے گا نہ ایسے صاحبِ کمال پیدا ہوں گے۔ ۱۲

ایسا جوش تھا کہ دروازے تک ان کا تعاقب کیا۔

(۱۰۲) مرزا دبیر کی جوانی تھی اور شاعری بھی عین جوانی پر تھی کہ ایک دھوم دھام کا مرثیہ لکھا۔ اُس کا نمود رتمہید سے چہرہ باندھا رزمیہ و بزمیہ مضامین پر خوب زورِ طبع دکھایا۔ تازہ ایجاد یہ کیا کہ لشکرِ شام سے ایک بہادر پہلوان طیار کر کے میدان میں لائے اُس کی ہیبت ناک صورت بدصورت۔ آمد کی آن بان۔ اُس کے اسلحۂ جنگ اُن کے خلافِ قیاس مقادیر و وزن سے طوفان باندھے۔ پہلے اس سے کہ یہ مرثیہ پڑھا جائے شہر میں شہرہ ہو گیا ایک مجلس قرار پائی۔ اُس میں علاوہ معمولی سامعین کے سخن فہم اور اہلِ کمال اشخاص کو خاص طور پر بھی اطلاع دی گئی روزِ معہود پر ہجوم خاص و عام ہوا۔ طلب کی تحریکیں اس اسلوب سے ہوئی تھیں کہ خواجہ آتش باوجود پیری و آزادی کے تشریف لائے مرثیہ شروع ہوا۔ سب لوگ بموجب عادت کے تعریفوں کے غل مچاتے رہے۔ گریہ و بکا بھی خوب ہوا۔ خواجہ صاحب خاموش سر جھکائے دوزانو بیٹھے جھومتے رہے۔ مرزا صاحب مرثیہ پڑھ کر منبر سے اُترے۔ جب دلوں کے جوش دھیمے ہوئے تو خواجہ صاحب کے پاس جا بیٹھے اور کہا کہ حضرت! جو کچھ میں

نے عرض کیا آپ نے سنا۔ فرمایا ہوں بھئی سنا۔ انھیں اتنی بات
پر قناعت کب تھی؟ پھر کہا آپ کے سامنے پڑھنا گستاخی ہے لیکن
آپ نے ملاحظہ فرمایا؟ انھوں نے فرمایا بھئی سنا تو سہی مگر میں سوچتا
یہ ہوں کہ یہ مرثیہ تھا یا لندھور[1] بن سعدان کی داستان تھی
(واہ رے اُستادِ کامل اتنے سے فقرہ میں عمر بھر کے لیے اصلاح دے گیا)۔

(۲۰۲) حیدرآباد دکن میں ایک دن چند معزز اشخاص بیٹھے تھے
ایک صاحب میر ببر[2] علی انیس کی تعریف کرنے لگے۔ فرمایا بھئی شاعر

---

[1] ملک لندھور کی خلاف عقل طاقتیں اور فوق العادت کارروائیاں امیر حمزہ کے
قصے کی شان و شکوہ اس طرح بڑھاتی ہیں کہ رستم و اسفندیار شاہنامہ کے صفحوں میں
مُنہ چھپا لیتے ہیں۔ [2] میر ببر علی انیس پیدائش محلہ گلاب باڑی فیض آباد ۱۲۱۶ھ
(۷۴) سال کی عمر میں ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ روز دوشنبہ قریب مغرب چوب دار محلے لکھنؤ
میں انتقال فرمایا۔ مرزا دبیر نے تاریخ وفات کہی ع "طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس"
میر مستحسن خلیق کے صاحبزادے اور میر حسن دہلوی کے پوتے تھے۔ لکھنؤ میں تربیت
پائی۔ اپنے خاندانی کمال مرثیہ گوئی میں باپ کے شاگرد تھے۔ ان کے بلکہ ان کے گھرانے
کی اردوئے معلّٰی کے لحاظ سے تمام لکھنؤ میں سند تھی حسنِ بیان، لطف محاورہ، کلام
کی صفائی اس درجے کی کسی دوسرے کو نصیب نہیں۔ یہی ہیں جو ہر رنگ کے مضمون، ہر
قسم کے خیال، ہر ایک حال کا اپنے الفاظ کے جوڑ بند سے ایسا طلسم (بقیہ نوٹ بر صفحہ آئندہ)

کون ہی؟ دُکھڑے کا کہنے والا ہوں۔ وہ بھی نہیں معلوم کہ جس طرح چاہیئے ہوتا ہی یا نہیں۔

(۲۰۳) ایک دن بعض عمائدِ شہر موجود تھے میر انیس صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ کہیں سے آم آئے۔ چوں کہ عمدہ تھے۔ مولوی صاحب[1] ممدوح نے طاسوں میں پانی بھروا کر رکھوا دیئے اور سب صاحبوں کو متوجّہ فرمایا۔ ایک حکیم صاحب اسی جلسے میں حرارت کی شکایت کر رہے تھے۔ مگر شریکِ چاشنی ہوئے کسی بزرگ نے کہا۔ حکیم صاحب! آپ تو ابھی علالت کی شکایت فرماتے تھے۔ حکیم صاحب تو بغلیں جھانکنے لگے۔ میر انیس نے فرمایا فِعْلُ الْحَكِيمِ لَا يَخْلُوا عَنِ الْحِكْمَةِ[2]

(۲۰۴) ایک دن میر انیس برِ شام سیر کو نکلے ان کے ساتھ اُن کے دو ایک احباب بھی تھے۔ چوک میں سے گزر ہوا۔ میر صاحب بڑے خوش رو، وجیہہ اور شکیل تھے۔ ایک طوائف اپنے کوٹھے پر سے دوپٹے کی آڑ کیے آپ کو جھانکنے لگی جب چوک سے نکل گئے ایک دوست نے میر صاحب سے اس کا ذکر کیا میر صاحب نے خود اُس عورت کو نہ دیکھا تھا شاید وہ کسی اور

(بقیہ نوٹ صفحۂ گزشتہ) باندھ دیتے ہیں کہ چاہے رلا دیں چاہے ہنسا دیں، چاہیں حیرت کی صورت بنا دیں۔ میر صاحب مرحوم نے کم سے کم دس ہزار مرثیئے ضرور کہے ہوں گے اور سلاموں کا کیا شمار ہی۔ رباعیاں تو بے انتہا ہیں ۱۲ کفیل

[1] مولوی شریف حسین خاں مراد ہیں۔ [2] حکیم کا فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ ۱۲

خیال میں مستغرق ہوں گے۔ یہ سُن کر آپ نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھا ۔
عاشق کو دیکھتی ہو دوپٹے کو تان کر ٭ دیتی ہو ہم کو شربتِ دیدار چھان کر

(۲۰۵) داغ[1] صاحب بڑے خوش مزاج، زندہ دل اور بذلہ سنج تھے مگر افسوس ہے کہ اُن کے ایک دو لطیفے بھی باوجود تلاش کے ہمارے ہاتھ نہ لگے۔ ذیل میں تین لطیفے اُن کے متعلق ہیں مگر خود اُن کے نہیں ہیں:۔

(۲۰۶) ایک مجلس میں حضرتِ داغ اور مولینا حالی موجود تھے کچھ شعر و شاعری کا ذکر چلا حضرتِ داغ سے ان کا کلام تازہ سُنانے کی فرمائش کی گئی۔ داغ صاحب ایک رندانہ طرز کے شاعر تھے اور مولینا حالی صاحب کا کلام ناصحانہ تھا حضرتِ داغ حضرت حالی کے برابر بیٹھے ہوئے تھے۔ داغ صاحب نے اپنی غزل پڑھی جس کی ردیف ہے "ہاتھ لا اُستاد کیوں کیسی کہی" اور جب مندرجۂ ذیل شعر پڑھا تو حالی صاحب کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ حالی صاحب نے خوش ہو کر شعر کی داد دی اور کہا فی الواقع خوب کہی ۔

تو بھی اے ناصح کسی پر جان دے ٭ ہاتھ لا اُستاد کیوں کیسی کہی

(۲۰۷) ایک دفعہ حیدر آباد میں ایک رئیس کے مکان پر کسی تقریب

[1] داغ کے متعلق نوٹ صفحہ ۱۵۶ و ۱۵۷ پر ملاحظہ ہو ۔ ۱۲

شادی میں محفلِ رقص منعقد تھی بڑے بڑے رئیس شریکِ جلسہ تھے۔ داغ صاحب بھی موجود تھے۔ حیدرآباد کی ایک مشہور طوائف نے داغ صاحب کی یہ غزل گائی۔ بہت تعریف ہوئی جب مقطع گایا تو داغ صاحب کی طرف خاص توجہ کے ساتھ بار بار اشارہ کر کے بتلاتی تھی جس سے اُن کو بہت خفّت ہوئی وہ مقطع یہ ہے۔ "دل و دین کا جس کو نہ پاس ہو یہی نامراد ہے دیکھ لو"

سلہ پرانی شاعری کی آخری کڑی حضرتِ داغ دہلوی تھے جو دہلی میں ۱۲ رذی الحجہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۲۵ رمئی ۱۸۳۱ء چہارشنبہ کے دن کو پیدا ہوئے اور ۹ رذی الحجہ یوم حج ۱۳۲۲ھ مطابق ۴ رفروری ۱۹۰۵ء کو بمقام حیدرآباد دکن وفات پائی آپ کا نام نواب مرزا داغ ہے ۱۳۲۲ھ اور یہی تاریخِ وفات ہے بیش گاہِ حضورِ پرنور نظام دکن بلبلِ ہندوستان جہاں استاد دبیرالدولہ فصیح الملک نواب ناظم یار جنگ بہادر خطاب ملا۔ ؎

جنابِ داغ کا مرنا ہے شاعری کی موت ٭ وہ مرگئے ہیں تو سمجھو کہ اس کی آئی موت

اور ایک دوسرا شعر بھی قابلِ ملاحظہ ہے ؎

گئی اردو کی رونق داغ کے ساتھ ٭ وہی دم تھا غنیمت وہ نہیں ہے

کتبہ لوحِ مزار۔ ؎

رفت از دہر چوں فصیح الملک ٭ لرزہ افتاد در تمامی ہند

اوستادِ نظامِ آصف جاہ ٭ موردِ لطفِ شاہِ حامیِ ہند (بقیہ نوٹ بر صفحہ آئندہ)

سلہ یہ وہی سال ہے جب کہ کانگڑے میں سخت زلزلہ آیا۔ ۱۲

"جسے داغ کہتے ہیں اے بتو! یہی روسیاہ کا نام ہے"

واضح ہو کہ داغ مرحوم سیاہ فام تھے۔

(۲۰۸) جب داغ صاحب کا تعلق ریاستِ رام پور سے تھا اور وہ برسرِ عروج تھے تو جیسا کہ دنیا کا دستور ہے کئی اُن سے جلنے والے بھی تھے۔ کسی دل جلے نے یہ شعر کہا ؎

شہرِ دہلی سے چل کے اک مُشکی * آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

مولوی نذیر احمد صاحب[1] کے چند لطیفے

۲۰۹ اگر ... صاحب نے مجھے کیمیاگر یا عاملِ دستِ غیب فرض کر لیا ہے تو میرے پاس اس کا کچھ جواب نہیں لیکن اگر فی الواقع میں ایسا ہوتا تو چار مہینے کے عوض چار برس کی مہلت دیتا۔ بلکہ شاید

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ)

راست برقامتش قبائے سخن * زیب بروئے خطابِ جامیِ ہند

سلکِ نظمش لبالبِ لاکِ گہر * جوہریِ سخن نظامیِ ہند

شد وفاتش بشامِ یوم الحج * دفن شد روزِ عیدِ سامیِ ہند

آہ دل برکشید و سائل گفت

مدفنِ پاکِ داغ نامیِ ہند

۱۳۲۲ھ

[1] ولادت ۲۴ جمادی الاولیٰ ۱۲۵۳ھ مطابق ۲ دسمبر ۱۸۳۶ء بمقام ضلع بجنور (بقیہ نوٹ صفحہ آئندہ)

مدّت العمر مطالبہ نہ کرتا مگر حال واقعی یہ ہے کہ نوٹ بنک میں رکھہ کر کارروائی کرتا ہوں۔ اس حقیقت نفس الامری کے جاننے کے بعد اُن کو اختیار ہے چار مہینے میں دیں چار برس میں دیں نہ دیں یا خدا توفیق دے تو ڈیوڑھے[1] کر دیں۔

(۲۱۰) طالب یعنی اُمیدوارِ خدمت کو چاہیئے کہ بمنزلہ کنکوّے کے ہو جس میں پرواز کا مادہ مہیّا اور صرف ایک دریائی کا محتاج ہے۔ اسی طرح امیدوار میں مادّہ لیاقت کا ہونا ضروری ہے۔ کہ سفارش کی ایک دریائی ملی اور اونچا ہوا۔۔۔ صرف دریائی نہیں چاہتے بلکہ چاہتے ہیں کہ دُم چھلّے کی طرح اُن کے ساتھ ساتھ لٹکا رہوں۔

(۲۱۱) ہم ارکینِ ثلثہ مجلس مال گزاری نے کام کو آپس میں

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) وفات ۱۵ رجادی الاولی سنہ ۱۳۳۰ھ مطابق ۳ رمئی سنہ ۱۹۱۲ء خطابات خان بہادر شمس العلماء۔ ایل۔ ایل ڈی (اڈنبرا) ڈی او ریل درگاہِ حضرت خواجہ باقی باللہ میں بمقام دہلی آسودہ ہیں۔ تاریخِ وفات ۔۔

علامۂ دہلی نذیر احمد ※ بد رحمتِ کبریا حیاتش

خواجہ زلبشیر گفتہ برخواں ※ داغفرلابی سِن وفاتش
۱۳۳۰

[1] جب واجب الادا ہو جائے۔ وقت مقررہ ۔ ۱۲

بانٹ رکھا ہے۔ نصب خدمات مولوی دلیل الدین صاحب کی طرف ہے اس لیے کہ تازہ وارد ناشناسا اور اجنبی ہیں میں نے اور اکرام اللہ خاں صاحب نے اس بوجھ کے اُٹھانے سے پہلوتہی کی اِتَّقُوا مِنْ مَوَاضِعِ التُّهَمِ ۱ تاہم دلالت علی الخیر کی طور پر مولوی احمد علی صاحب کی سفارش میں مولوی دلیل الدین صاحب کے نام رقعہ لکھ دیا ہے جس کی عبارت قریب قریب اس کے ہے۔ رقعہ یہ صاحب جو اس رقعہ سے حاضر خدمت ہوتے ہیں۔ حافظ ہیں آپ سے بہتر میرے برابر حاجی ہیں مجھ سے اور آپ سے دونوں سے بہتر۔ مدّت سے اُمیدوار خدمہ تحصیلداری ہیں مجھ سے اور آپ سے دونوں سے کم تر۔

یوں پھریں اہلِ کمال آشفتہ حال افسوس ہے
اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

(۲۱۲) ایک مرتبہ نواب سرسالار جنگ بہادر اوّل نے ارکانِ مجلس مال گزاری کی نسبت مولیناسے دریافت کیا آپ نے عرض کیا ہم ارکانِ ثلثہ مصداق ہیں کُلُوا وَ اشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا کے لطف اس لطیفے کا یہ ہے کہ ایک رکن مولوی دلیل الدین صاحب تھے جن کو جوع البقر کا عارضہ تھا۔ دوسرے اکرام اللہ خاں صاحب

۱ تہمتوں کی جگہ سے (مواقع) سے بچتے رہو۔ [illegible] ۱۲

قصبہ کاکوری من مضافاتِ لکھنؤ کے رئیس تھے جن کو شراب کباب کا شوق تھا جیسا امیروں کو بالعموم ہوتا ہے تیسرے مولوی نذیر احمد صاحب تھے جو مصداق تھے حالی کی اس رباعی کے (رباعی)

مسرف نہ بس اپنے حق میں کانٹے بوئیں ٭ نعمت نہ خدا کی رائگاں یوں کھوئیں
گر بخل پہ لوگ اُن کے ہنسیں بہتر ہے ٭ اس سے کہ فضولیوں پہ اُن کی روئیں

(۲۱۳) **اکونٹنٹ جنرل** کے دفتر میں پنشن کا ایک صیغہ خاص ہے۔ وہاں یہ بات مستنبط کی گئی ہے کہ پنشن خوروں کا اوسط عامۂ اعمار کے اوسط سے ایک ثلث کے قریب گھٹا ہوا ہے سوچنے سے معلوم ہوا کہ لوگ زمانۂ اشتغال لوازمِ خدمت کو شرطِ زندگی بنا لیتے ہیں۔ خدمت سے علیٰحدہ ہوتے پیچھے چوں کہ کوئی مشغلہ نہیں رہتا جلد مر جاتے ہیں۔ فَاعْتَبِرُوْا[۱] یَا اُولِی الْاَبْصَار

(۲۱۴) **مولوی** ... اپنی بیوی سے بہت مانوس تھے۔ بی بی مریں تو مولوی صاحب دنیا سے ایسے دل برداشتہ ہوئے کہ کسی چیز کی نظر میں وقعت باقی نہ رہی یہاں تک کہ نوکری کی اور بچوں کی۔ مولوی صاحب کو ایک بزرگ سے تھی ارادت اُن کو اس کیفیت سے آگاہی دی۔ اُن بزرگ نے فرمایا کہ یہ سب

---

[۱] پس عبرت پکڑو اے آنکھوں والو۔ ۱۲

خدعِ نفس ہی، اس کو تبتیل اور انابت الی اللہ مت سمجھو۔ مولوی صاحب نے اپنے وجدان کے مقابلے میں اس کو تسلیم نہ کیا۔ شیخ نے اُن کا اصرار دیکھ مراقبہ در کچھ وظیفے بتا دیئے۔ مولوی صاحب چندے کرتے رہے مگر کوئی جدید کیفیت پیدا نہ ہوئی آخر ملول ہو کر کنایۃً شکایت کی۔ یہاں تک حکایت ہی جو بات مجھ کو کہنی تھی وہ یہ ہی کہ شیخ نے شکایت سُن کے فرمایا کہ جس دن سے تم نے ہوش سنبھالا طلبِ دنیا میں منہمک رہے اس طلب میں تم کو اتنی ہی کامیابی ہوئی کہ ایک نوکری مل گئی جو نہ سلطنت ہی نہ وزارت نہ کامل حکومت نہ کافی امارت۔ طلبِ دین میں تم نے اپنی عمر کا کون سا حصہ صرف کیا شاید ہزاروں درجے کی ایک کسرِ اعشاری اور ابھی سے مناصبِ غوث و ابدال کے اُمیدوار ہو ع اِیں خیال ست و محال ست و جنوں۔

حکیم سنائی کا کیا اچھا قطعہ ہی:۔

قرنہا باید کہ تا یک کودکے از لطفِ طبع ※ عاقلے کامل شود یا فاضلے صاحب سخن
سالہا باید کہ تا یک سنگِ اصلی ز آفتاب ※ لعل گردد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن
ماہ ہا باید کہ تا یک مشتِ پشم از پشتِ میش ※ صوفئے را خرقہ گردد یا حمارے را رسن
ہفتہ ہا باید کہ تا یک پنبہ از آب و گل ※ شاہدے را حلہ گردد یا شہیدی را کفن
روزہا باید کشیدن انتظارِ بے شمار ※ تا کہ در جوفِ صدف باراں شود درِّ عدن

(۲۱۵) **انگریزی خوانوں** میں بڑا، بہت بڑا، بہت ہی بڑا نقصان یہ دیکھنے میں آیا کہ ان لوگوں میں مطالعے کا دستور نہیں اور چونکہ طبیعت پر غور و خوض کا بوجھ نہیں ڈالتے ہیں نے جہاں تک دیکھا استنباطِ مطلب میں اکثر خطا کرتے ہیں۔ آج کل کے بی۔ اے ایم۔ اے۔ بات صاف تو یہ ہے کہ ہم لوگوں کی نظروں میں مطلق نہیں جچتے۔ محاملِ الفاظ اور تعلقاتِ سابق و لاحق اور عبارت کے اطراف و جوانب اور مضمون کے ماله اور ما علیہ پر کبھی ان کی نظر کو احاطہ کرتے نہ دیکھا بس ان کی مثال اُس غوطہ زن کی سی ہے جس میں قعرِ دریا تک پہنچنے کا دم نہیں، ڈبکیاں لگاتا ہے اور دُرِ مطلب کو نہیں پاتا۔

(۲۱۶) **حضرت موسیٰ** علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حکم ہوا تھا خضر سے جا کر سیکھو وہ قصہ قرآنِ مجید کے پندرہویں پارے کے آخیر اور سولھویں کے شروع میں ہے۔ الغرض خضر نے موسیٰ سے شرط کر لی تھی کہ تم میری کسی بات میں دخل نہ دینا۔ موسیٰ سے صبر نہ ہو سکا اور لگے بات بات پر اُلجھنے پہلی دفعہ خضر نے اُن کو متنبہ کیا بہ ایں عبارت اَلَمْ اَقُلْ لَکَ اِنَّکَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا[۱] پھر دوبارہ

---

[۱] میرے ساتھ تم سے ہرگز صبر نہیں ہو سکے گا۔ ۱۲

اُس میں زیادہ کرکے گویا شکنجۂ ملامت کا ایک پیچ اور کس دیا۔
اُس پر ایک ظریف بے ساختہ بول اُٹھے کہ موسیٰ تو چلبلے تھے ہی خضر بھی کچھ کم غصیلے نہ تھے کہ دوسری ہی خطا میں لام کاف[1] پر اتر پڑے۔
(۲۱۷) جس زمانے میں مولانا سمتِ شمال (ملکِ دکن کا ایک صوبہ ہے) کے صدر تعلقہ دار تھے اُن کی پیشی میں کاشی راؤ نامی ایک اہلکار رہا کرتا تھا وہ بوجہ مزاج شناسی۔ زود نویسی اور خوش فہمی کے پیش پیش تھا۔ لیکن اُسی کے ساتھ وہ واحد العین بھی تھا۔ سر سالار جنگ اول نے ایک دفعہ اثنائے ملاقات میں بر سبیلِ تذکرہ مولانا سے پوچھا کہ کہیئے آپ کے ڈویژن کا کام کس طرح چل رہا ہے۔ مولانا نے جواب دیا کہ سارے صوبے کا کام صرف تین آنکھوں پر چلتا ہے۔ سر سالار جنگ متحیر ہوکر پوچھنے لگے یہ کیوں کر ہے مولانا نے جواب دیا کہ دو میری آنکھیں اور ایک میرے اہلکار پیشی کی۔
(۲۱۸) سفرِ پنجاب میں مولانا آنریبل سر سید کے ساتھ تھے واپسی کے وقت لدھیانے میں ... کی کوٹھی میں قیام ہوا ایک پادری صاحب نے مولانا سے اپنے زعم میں اسلام کے نقائص میں صحیح بحث شروع کی سب سے بڑا الزام جنت کی حالت پر لگایا کہ مسلمانوں نے

---

[1] اردو میں تو تڑاق سخت کلامی ۱۲

جنّت کو بازاری عورتوں کا چکلہ بنا دیا ہی جو خداوندِ تعالیٰ جَلّ وَعَلَا شانُہ کی عظمت و جبروت اور تقدّس کے صریح خلاف ہی۔ ممکن نہیں ہی کہ وہاں ہزاروں حوریں اور غلمان ہوں اور اگر ایسا ہو تو خدا کی خدائی میں فرق آجائے۔ مولانا نے ہنس کر جواب دیا کہ "یہ تو خبر نہیں کہ وہاں ایسا ہو یا نہ ہو لیکن دنیا میں تو ہم ایسا ہی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ بازاری عورتیں بھی موجود ہیں اور کیا کچھ نہیں ہی اور کیا کچھ نہیں ہوتا اور یہ ظاہر ہی کہ جو کچھ ہوتا ہی خدا کے حکم سے ہی ہوتا ہی۔ دنیا میں بھی سب چیزوں کا پیدا کرنے والا وہی ہی تاہم اُس کو سب خدا مانتے ہیں۔ کوئی اُس کی خدائی سے روگرداں نہیں ہوا۔ پس اگر وہی خدا مرے بعد جنّت میں ایسا کرے تو کوئی وجہ نہیں ہی کہ دُنیا میں تو وہ با ایں ہمہ سب کائنات کا خدا مانا جائے اور عقبیٰ میں اگر ایسا کرے تو اُس کی شانِ الٰہی میں فرق آجائے جو خدا یہاں ہی وہی وہاں ہی"

(۲۱۵) کسی نے سرسید کی تفسیر کے متعلق مولانا کی رائے دریافت کی تو فرمانے لگے "میرے نزدیک وہ تفسیر دیوانِ حافظ کی اُن شروح سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی جن کے مصنّفین نے جوڑ توڑ سے کان ناک گا نٹھ کر سارے دیوان کو کتابِ تصوف بنانا چاہا۔ جو معانی سید احمد خاں

سے منطوق آیاتِ قرآنی سے اپنے بندارہیں استنباط کیئے مگر میرے نزدیک زبردستی مڑھے اور چپکائے ہیں۔ ہاں ہاں قرآن کے مُنزّل من اللہ ہونے سے انکار کرنا سہل ہے اور اُن معانی کو ماننا مشکل یہ وہ معنی ہیں جن کی طرف نہ خدا کا ذہن منتقل ہوا نہ جبرئیل حاملِ وحی کا نہ رسولِ خدا کا نہ قرآن کے کاتب و مدوّن کا نہ اصحاب کا نہ تابعین کا نہ تبع تابعین کا نہ جمہور مسلمین کا۔"

(۲۳۰) مولٰنا غالباً ضلع جالون کے بندوبست کے کام میں مشغول تھے اور دورہ کر رہے تھے۔ رمضان کا مہینا اتّفاق سے ایک دوست متشدّد فی المذہب دن کے وقت تشریف لائے اور مولانا کو حقّہ پیتے دیکھ لیا تو تعجّب کیا اور پوچھا کہ کیا آپ کا روزہ نہیں؟

مولٰنا۔ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے آپ دیکھتے ہی ہیں۔

دوست۔ خیر ہے کیا عذر ہے؟

مولٰنا۔ سفر!

دوست۔ دَورے کو امام ابوحنیفہؒ نے سفر تسلیم نہیں کیا۔

مولٰنا۔ کون امام ابوحنیفہؒ؟

دوست۔ ایں۔ آپ کیسی تجاہلِ عارفانہ کی سی باتیں کرتے ہیں اجی وہی امام ابوحنیفہؒ جن کے ہم سب حنفی مقلّد ہیں۔

مولانا۔ وہ کہیں بندوبست کے ڈپٹی کلکٹر بھی رہے تھے۔؟

دوست۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ اُن کی شان اِس سے ارفع واعلیٰ تھی۔ اُنہوں نے خدمتِ قضا تو قبول کی ہی نہیں ڈپٹی کلکٹری لعنت ہیچ کیا چیز ہی۔

مولانا۔ امام ابو حنیفہؒ "زحمتِ کشتی نیازمودہ بود" تو دورے کو سفر نہیں مانتے اور گورنمنٹ تین روپیہ روز بھتہ دیتی ہی از برائے خدا کہیں یہ مسئلہ کسی حاکم کے گوش گزار نہ کر دیجئے گا۔ ورنہ ہم بےچارے ڈپٹی کلکٹروں کا بھتہ مارا جائے گا۔

(۲۲۱) مولانا فرماتے تھے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے بعض مرید میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ مرزا قادیانی کی صداقت کی ایک دلیل یہ ہی کہ سارا پنجاب اُن کا قائل ہی۔ میں نے کہا کہ پنجاب کے لوگوں کی سند نہیں۔ اُن کی ڈھکمل یقینی کا تو یہ حال ہی کہ اگر میں چھ مہینے وہاں پھروں اور دعویٰ بھی کوئی معمولی نہ کروں بلکہ دعوائے خدائی تو اسی چھ مہینے کے عرصے میں آپ کو پچاس ہزار بندے دکھا سکتا ہوں۔ فرماتے تھے کہ یہ مضمون کسی نے مرزا تک پہنچا دیا۔ اُسی زمانے سے وہ مجھ سے بیزار رہے۔ اسی طرح مرزا کی نسبت ایک دفعہ یہ بھی کہا کہ مسیح موعود مرزا قادیانی کو تو کون مانتا ہی یہ وہ

زمانہ ہے کہ اگر اصلی مسیح بھی اُتر آئیں تو اُن کو بھی کوئی نہ مانے۔

(۲۲۲) مولٰنا فرماتے تھے کہ ایک بار دلّی میں فتویٰ نکلا تھا کہ اجمیر اور کچھوچھا اور تونسہ شریف کہنا درست بھی ہے یا نہیں ایک شخص نے مجھ سے یہ مسئلہ پوچھا میں نے تو اُس کو یہ جواب دیا تھا کہ اگر معراج شریف کہنے میں شرعًا مضائقہ ہو سکتا ہے تو بے شک اجمیر شریف میں بھی تامّل ہے۔

(۲۲۳) دہلی دربار کے زمانے میں ایجوکیشنل کانفرنس بھی وہیں دہلی میں منعقد ہوا تھا میں بھی اُس کانفرنس میں موجود تھا مولٰنا اکبر بیٹھے رہے تھے کہ اتنے میں کسی ریاست کے رزیڈنٹ کانفرنس میں آئے۔ نواب محسن الملک مرحوم نے رزیڈنٹ بہادر سے مولٰنا کا تعارف کرایا۔ تعارف کرتے ہوئے نواب صاحب نے مولٰنا کی طرف ہو کر کہا کہ آپ (رزیڈنٹ) عربی بھی جانتے ہیں۔ مولٰنا نے نہایت سادگی اور سوکھے مُنہ سے فرمایا "جی ہاں جتنی عربی آپ جانتے ہوں گے اُتنی انگریزی میں بھی جانتا ہوں" اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ وہ کیا عربی جانتے ہوں گے۔

(۲۲۴) اسی کانفرنس میں مولٰنا اکبر بیٹھے رہے تھے کہ لے تھنے میں لارڈ کچنر کمانڈر انچیف افواجِ ہند کی آمد کی خبر گرم ہوئی اور ہنس

نے خبر سُنتے ہی مولانا کی طرف سے بے توجہی کی اور لگے دروازے کی طرف دیکھنے اول خبر پہ کمانڈر انچیف نہ آئے تو آڈئینس مولانا کے لکچر کی طرف پھر مخاطب ہو گئی۔ دوران لکچر میں پھر یہ خبر مشتہر ہوئی کہ کمانڈر انچیف صاحب وہ آئے۔ آڈئینس یہ سُن کر پنڈال کے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ مولانا نے آڈئینس کا یہ حال دیکھ کر لکچر تو میز پہ رکھ دیا اور فرمایا کہ "اگر وہ آتے ہیں تو بندہ جاتا ہے" اس کے بعد فرمایا "وہ کیا آتے ہیں قیامت آتی ہے اپنے اپنے گھر جاکر دیکھو کہیں اسقاطِ حمل تو نہیں ہو گئے۔ غرض اسی دوران میں لارڈ کچنر تھوڑی دیر کے لیئے کانفرنس میں آئے چند منٹ بیٹھنے کے بعد کچھ تقریر کرکے بیٹھ گئے۔ لوگوں نے بہت کچھ تحسین و آفرین کی اس کے بعد وہ تشریف لے چلے ابھی اسٹیج سے نیچے نہیں اُترے تھے کہ مولانا نے برملا اور بلا تامّل فرمایا۔ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ط اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۔[1] اہلِ کانفرنس یہ سُن کر ہنس پڑے۔ سُنا ہے کہ لارڈ کچنر عربی بھی جانتے ہیں اُنھوں نے افریقہ میں مسلمانوں کے لیئے خرطوم میں ایک کالج بھی قایم کیا ہے۔

(۲۲۵) اسی کانفرنس کے پریسیڈنٹ اس سال ہز ہائی نس

[1] (لوگوں سے) کہہ دو کہ یعنی دین برحق آیا (دین) باطل نیست و نابود ہوا اور (دین) باطل تو نیست و نابود ہونے والا ہی تھا۔ ۱۲

سر آغا خاں تھے جس وقت مولانا کا لکچر ہو رہا تھا اُس وقت تک ہز ہائی نس پنڈال کانفرنس میں نہیں پہنچے تھے اثنائے لکچر میں ہز ہائی نس آئے اور کرسیِ صدارت پر جلوہ افروز ہوئے باوجودے کہ پنڈال اتنا بڑا تھا اور ہزارہا مسلمان زرق برق لباس میں نظر آتے تھے اُن میں ہر قسم کے خوب صورت اور صاحب وجاہت تھے لیکن ہز ہائی نس کے آتے ہی ماشاءاللہ سب کے رنگ پھیکے پڑ گئے سب سے اول نواب محسن الملک بہادر کے ذریعے سے ہز ہائی نس اور مولانا میں تعارف ہوا۔ مولانا کے ہاتھ میں جو لکچر تھا وہ اُنھوں نے میز پر رکھ دیا اور بڑی متانت کے ساتھ ہز ہائی نس سے مخاطب ہو کر فرمایا ؎

آفاق ہا گردیدہ ام مہرِ بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

اس برجستہ اور فی البدیہہ گوئی پر نہ صرف آڈینس[1] ہی خوش ہوئی، بلکہ ہز ہائی نس بھی مُنہ پر رومال رکھ کر بہت دیر تک مُسکراتے رہے اور آڈینس نے تو مولانا سے اس شعر کو چیز دے دے کر دو چار مرتبہ پڑھوایا۔

[1] حاضرین مجلس۔

مولانا کی فارسی تحریرات برجستہ کے چند نمونے

(۲۲۶) "دوم تعلقہ دار دورہ کہ می کنند لطورِ سیاحت - روزنامچہ کہ می نویسند بطورِ حکایت - دستخطے کہ می کنند ہم چو زلفِ محبوباں اُفتاں و خیزاں"

(۲۲۷) "تعلقہ دار اندور بدیر می گویند مگر خوب می گویند"

(۲۲۸) "تجاویزِ ایں صدر تعلقہ وار مبتدیانِ کم سواد یا منشیانِ بے استعداد - مبیّضہ می کنند و بوجہ نالیاقتیِ شاں تحریف و تصحیفِ اصل تجویز میشود - آیندہ اگر ایں چنیں مرئی و معائن شود از سرِ ا درگزر نخواہم کرد"

(۲۲۹) "کیروی[1] خراب کردی"

(۲۳۰) "سائے براخبار باؤتیہا[2] دستخط کردن و اُمید انتظام داشتن دماغِ بیہودہ پختن است -"

(۲۳۱) "خاصیتِ ماکیاں دارد خود نمی خورد و بچگان خود را می خوراند"

---

[1] اِس کو انگریزی میں لیجر کہتے ہیں یہ بے قاعدہ لکھی گئی تھی اور جا بجا خراب تھی اس پر یہ پرلطف ریمارک کیا۔ [2] ملک دکن میں رعایا کے پاس وصول رقم مالگزاری کی جو رہتی ہیں اُسے باؤتی کہتے ہیں صدر تعلقہ دار کی زمانے میں جب وہ کثرت سے پیش ہوئیں تو یہ ریمارک کیا تھا۔

(۲۳۲) ایک آئین (انسپکٹر پولیس) نے سوپرنٹنڈنٹ پولیس کی شکایت کی اُس پر ریمارک "اضطرابِ آئینِ اندور (حال نظام آباد) قبل از وقوعِ واقعہ اندریں خصوص از چہ رو ست۔ آں را کہ حساب پاک است از محاسبہ چہ باک زند جامۂ ناپاک گازراں بر سنگہا۔"

(۲۳۳) حسن بن عبد اللہ صاحب تعلقہ دار (کلکٹر) ضلع میدک نے کثرت کار کی شکایت کی اُس پر ریمارک۔

"ضلع میدک یک بالشت تعلقہ دار چیست تحصیل دار درست با این کارروائی ست"

(۲۳۴) تعلقہ دار ضلع اندور سے خطاب۔ دفتر ضلعِ اندور کانِ نمک است عرضی ہذا برائے شرکت در آں کانِ نمک مرسل ہر چیز کہ در کانِ نمک رفت نمک شد۔

(۲۳۵) ایک عرضی پر شرح۔ عرضی گزار را قید کنند، قتل کنند ہر چہ کنند زود کنند۔

(۲۳۶) محاسب کی شکایت پر تعلقہ دار کو جواب۔ از بیت سندھیانِ (مذکور بیان) دیہ تا اول تعلقہ دار ضلع آوردگانِ خودی بندارم چہ محاسب اتارا اُو کوہے نیست کہ از ہیچ کند دیدہ نہ شود۔

(۲۳۷) ایک تحصیل دار کی نسبت۔ تا وقتیکہ دمار از مہر نہ

بآرم بر جادۂ اعتدال نہ خواہد آمد۔

(۲۳۸) **مطبع کی منتقلی**۔ صدر تعلقہ داری (کمشنری) کے متعلق ایک مطبع تھا۔ صدر مددگار صاحب صیغۂ عدالت میں اُسے منتقل کرنا چاہتے تھے اُن کو یہ جواب دیا گیا۔

"در دسر چنداں کہ کم تر بہ"

(۲۳۹) **محافظ دفتر کی نسبت ریمارک**۔ صدر تعلقہ داری کا محافظ دفتر لنگڑا تھا اُس کی نسبت ریمارک "محافظ دفتر مثل میموں بایدگاہ براین الماری وگاہ بداں الماری نہ کہ این پیر فرتوت شصت سالہ"

(۲۴۰) **تعلقہ دار کو**۔ اُس ماتحت کارکن کو میرے پاس بھیج دیجئے میں اُس کو درست کروں وہ تختہ (نقشہ) کو۔

(۲۴۱) **محاسب کی طرف خطاب**۔ سررشتہ دار کو نصف تنخواہ جرمانہ کرکے تختہ نظر ثانی لیا اب تم سے تختہ سیت سنبھالنا لینا ہے کیوں کر دیجئے گا۔ آپ بھلے طور سے یا کسی جرمانے کا انتظار ہے؟

(۲۴۲) **تعلقہ دار کی نسبت**۔ رفتن تعلقہ دار باہجوم کاربار یاراحسان تبست۔

(۳۴۳) اَشتیا۔ را دیدم بسیار خندیدم۔ فرتوت است، کجا کارِ سرکار و کجا ایں پیرِ ناہنجار؟

(۳۴۴) **نقل** ہے کہ **لقمان** حکیم کے پاس اوّل مرتبہ **عقل** آئی پوچھا تو کون ہے کہاں رہتی ہے؟ جواب دیا کہ میں عقل ہوں اور سر میں رہتی ہوں۔ دوسری مرتبہ **شرم** آئی پوچھا تو کون ہے؟ جواب دیا میں شرم ہوں، فرمایا کہاں رہتی ہے؟ کہا "زیرِ چشم" تیسری مرتبہ **محبت** آئی دریافت کیا تو کون ہے اور کہاں رہتی ہے۔ جواب دیا کہ میں محبّت ہوں اور دل میں رہتی ہوں۔ چوتھی مرتبہ **تقدیر** آئی پوچھا تو کون ہے اور کہاں رہتی ہے؟ جواب دیا تقدیر ہوں اور سر میں رہتی ہوں آپ نے فرمایا، وہاں تو عقل رہتی ہے جواب دیا کہ جب تقدیر آتی ہے تو عقل پہلے ہی رخصت ہو جاتی ہے۔ پانچویں مرتبہ **عشق** آیا۔ دریافت کیا تو کون ہے اور کہاں رہتا ہے؟ جواب دیا کہ میں عشق ہوں اور آنکھوں میں رہتا ہوں آپ نے کہا کہ وہاں تو شرم رہتی ہے۔ جواب دیا کہ عشق آتا ہے تو شرم اٹھ جاتی ہے۔ چھٹی مرتبہ **طمع** آئی پوچھا تو کون ہے؟ اور کہاں رہتی ہے؟ کہا میں طمع ہوں اور دل میں رہتی ہوں۔ فرمایا اس جگہ تو محبت رہتی ہے کہا جب طمع آتی ہے تو محبّت اٹھ جاتی ہے۔

(۴۴۵) ایک وکیل صاحب نے کسی پادری سے پوچھا اگر پادری اور شیطان کا مقدمہ کچہری میں جائے تو ان میں سے کون جیتے گا پادری نے جواب دیا کہ جنابِ من شیطان ہی جیتے گا۔ کیوں کہ سب وکیل اُسی کی طرف ہو جائیں گے۔

(۴۴۶) میرے دوستوں میں ایک صاحب لکھنؤ کے رہنے والے شیعہ مذہب سے تھے۔ نہایت مشیّن اور خوش رو خوش لباس میرا اُن کا مذاق ہوا کرتا تھا۔ ایک دن میں نے ان آقا کہا کہ "کیوں جی! یہ کیا بات ہے کہ شیعوں کے مُنہ پر رونق نہیں ہوتی"؟ اُنہوں نے کہا جی یہ تو کچھ مشکل بات نہیں۔ آپ اور میں دونوں بازار میں نکلیں معلوم ہو جائے گا کہ کس کے چہرے پر زیادہ رونق ہے"

(۴۴۷) ایک صاحب نے کسی ظریف سے کہا کہ جس فرقے کے نام میں بان ہو جیسے فیلبان۔ باغبان۔ ساربان۔ گاڑی بان وہ بڑے بد ہوتے ہیں۔ ظریف بولا "ہاں مہربان"

(۴۴۸) ایک احمق بیمار ہو کر حکیم جی کے پاس گئے۔ حکیم جی نے کہا کل سویرے قارورہ لے کر آنا تو تمہارے مرض کی تشخیص کی کی جائے گی۔ سوئے اتفاق سے اسی رات بیوی بھی بیمار پڑ گئی مریض نے کہا حکیم جی قارورے بغیر علاج کرتے نہیں اپنا اور اپنی بیوی

کا قارورہ دونوں یکجا ایک ہی شیشی میں ملا کرے گیا اور کہا لیجئے میرا اور میری بیوی دونوں کا قارورہ ملاحظہ ہو۔ ایک اور احمق مطب میں بیٹھے تھے بولے۔ تو بھی عجب بیوقوف ہے دونوں قارورے ایک ہی شیشی میں لایا تھا تو بیچ میں ڈورا کیوں نہ باندھ دیا کہ دونوں الگ الگ رہتے۔

(۲۴۹) ایک **بیوقوف** ٹٹوانی پر سوار گٹھا گھاس کا اپنے سر پر رکھے ٹخ ٹخ کرتے چلے جا رہے تھے۔ ایک شخص نے کہا تو بڑا بیوقوف ہے گھاس کا گٹھا اپنے سر پہ کیوں رکھا۔ اُس نے کہا میں بیوقوف نہیں تُو بیوقوف ہے ایک تو گھوڑی گابھن اوپر سے میں سوار اگر گٹھا گھاس کا اُس پر لاد دیتا اور بوجھ ہوتا یا نہیں۔

(۲۵۰) ایک عمارت کی تعمیر کی ضرورت سے خلیفۂ بغداد کو ایک بہت بلند ستونِ چوبی کی ضرورت تھی مگر راست نہ ملتا تھا۔ چوطرف پروانے دوڑائے گئے کہ جہاں ملے فوراً لے آئیں۔ غرض بہت کچھ تلاش کے بعد ایک سیدھا ستون جیسا کہ مطلوب تھا دستیاب ہوا۔ جب اُسے شہر بغداد کے قریب لائے تو خلیفہ بہ نفسِ نفیس خود استقبال کو گیا۔ اتفاقاً بہلول دانا بھی اُس وقت موجود تھے اور بھیڑ کو چیر پھاڑ کر اندر جا گھسے

اور کچھ دیر سرگوشی کی۔ خلیفہ نے پوچھا حضرت کیا کہا اور کیا سُنا؟ حضرت نے فرمایا میں نے پوچھا کہ تو ایسی نایاب اور بیش قیمت لکڑی نہیں ہے کہ تیرے لئے خلیفۂ زمان استقبال کو آئے" لکڑی نے زبانِ حال سے کہا کہ میری راستی اس قدر و منزلت کا باعث ہوگئی۔

(۲۵۱) ایک جوان چیتے کی کھال زین پر ڈال کر اینٹھتے ہوئے بڑے ٹھسّے سے چلا جا رہا تھا ایک خدا رسیدہ بزرگ یہ دیکھ کر بولے۔ اَرے میاں! یہ کھال جب چیتے کے پیٹھ پر نہیں رہی تو تیری ران تلے کب تک رہے گی؟"

(۲۵۲) ایک امیر نے ایک حکیم سے کہا "میں آپ کو سو دینار دینا چاہتا ہوں" حکیم بولا "اگر دے تو تیرے حق میں بہتر ہے اور نہ دے تو میرے لیے بہتر کہ تیرے بارِ احسان سے سبک دوش رہوں"

(۲۵۳) ایک شخص نے معتصم باللہ کے سامنے آکر پیغمبری کا دعویٰ کیا۔ پوچھا تمہارے پاس معجزہ کیا ہے؟ کہا "مُردے کو زندہ کر دیتا ہوں" معتصم نے کہا کہ اگر یہ معجزہ تم نے کر دکھلایا تو میں تم پر ایمان لے آؤں گا اور جو نہ دکھایا تو تمہاری گردن اُڑا دوں گا۔ اُس نے تلوار مانگی خلیفہ نے اپنی شمشیرِ آبدار دے دی تلوار تول کر وہ بولا۔ ابھی دیکھ لیجئے، میں آپ کے وزیر کی گردن

اُڑا دیتا ہوں اور معاً زندہ کر دیتا ہوں خلیفہ نے کہا اچھا اور وزیر کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہو تم کیا کہتے ہو؟ وزیر نے عرض کیا کہ جان بڑی پیاری ہے مرنا کچھ آسان بات نہیں، آپ گواہ رہیئے کہ میں بلا گردن مارے ہی اس شخص پر ایمان لے آیا۔ خلیفہ ہنسا اور وزیر کو خلعت دیا اور جان گیا کہ مدعی نبوّت محتاج ہے۔ احتیاج نے اُسے اس دعوے پر مجبور کیا ہے، اُسے بھی انعام اکرام دے کر رخصت کیا۔

(۲۵۴) ایک شخص نے سرِ راہ حجاج بن یوسف سے سوال کیا مگر کچھ نہ ملا، پھر آگے بڑھ کے دوبارہ سامنے آیا اور دستِ سوال پھیلایا۔ حجاج نے کہا ابھی ابھی تو سوال کر چکا اور میں نے کچھ نہیں دیا تو کیسا احمق ہے پھر دوبارہ کیوں مانگتا آیا؟ وہ بولا کوئی جگہ متبرک ہوتی ہے کوئی منحوس۔ وہ مقام جہاں میں نے پہلے سوال کیا تھا میرے حق میں نحس تھا، میں جگہ بدل کر یہاں آیا کہ شاید یہ جگہ برکت کی ہو۔ حجاج ہنسا اور اُسے کچھ دیا۔

(۲۵۵) کسی نے ایک لڑکے سے پوچھا کہ کیا تو اپنے باپ کا مرنا چاہتا ہے؟ اُس نے کہا نہیں مگر کیا اچھا ہو کہ کوئی اُسے قتل کرے کہ میراث کے علاوہ مجھے خوں بہا بھی ملے۔

(۲۵۶) ایک فاضلِ اجلّ کسی حکیم کے پاس گئے اور یوں گویا ہوئے کہ دوریں لیل کہ سمتِ اعضا پذیرفتہ بعد از تغذیہ کہ در ریگِ معدہ کشکاب شدہ قوت آں بکند سریان کردہ و ازاں جالعیروقیا ماسانیقا تصاعد نمودہ قلیل صداع از طرفِ یار عارض شدہ عاقبت بسرسام انجامید حالا عجیب ایں مسئلہ باید شد کہ سببِ ایں چہ باشد و علامتِ ایں چہ و علاج ایں چیست؟ حکیم نے غلام سے کہا "میاں ذرا قاموس (لغت کی کتاب) اٹھا لا تاکہ دیکھوں یہ مردک کیا بکتا ہے"

(۲۵۷) ایک ظریف جب دیکھو ہر مجلس میں مسخرہ پن کرتا تھا۔ ایک زاہد نے کہا "ارے کم بخت تو نے اپنی ساری عمر اسی مسخرے پن میں گنوائی اب بھی تو سنبھل کہ تجھے دوزخ کا کندہ نہ بنانا پڑے" ظریف نے کہا "یہ بھی ایک اور مسخرہ پن ہو گا"

(۲۵۸) کسی بادشاہ کے دربار میں شعراء کا مجمع تھا ان کے ساتھ ایک لڑکا بھی تھا شعراء عمدہ عمدہ اشعار پڑھ کے صلہ پا رہے تھے۔ لڑکا منہ دیکھ رہا تھا۔ بادشاہ نے کہا "میاں لڑکے تم بھی کوئی شعر پڑھو" لڑکے نے کہا میں شاعر نہیں غاوی ہوں کہ ان شاعروں کے ساتھ آگیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَالشُّعَرَاءُ یَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ'' بادشاہ ہنسا اور اُسے بہت سا انعام دے کر خوش کر دیا۔

(۲۵۹) گاہک (بال کٹواکر) بدتمیز تو نے بالوں کے ساتھ میرا کان بھی کاٹ ڈالا۔

حجام۔ حضور یہ تو ذرا سا کٹا ہے۔ اس سے سماعت میں فرق نہیں آئے گا۔

(۲۶۰) ایک صاحب کو اپنے لڑکے سے شکایت تھی کہ وہ عہدی ہے اور کچھ کام نہیں کرتا۔ اور تنگ آکر انہوں نے اپنے ایک دوست سے کہا کہ بھائی آپ ہی اس کو سمجھائیں کہ یہ کسی کام پر لگ جائے چنانچہ انہوں نے لڑکے سے جاکر یہ گفتگو کی۔

بیٹا مجید تم پڑے پڑے کیا کرتے ہو کچھ کام کرو۔ روزگار کرو۔

بیٹا۔ حافظ جی کام کرنے سے کیا ہوگا؟

حافظ جی۔ کام کرنے سے روپیہ کماؤ گے۔ اطمینان سے خرچ کروگے چار پیسے بچاؤ گے تو روپیہ والے کہلاؤ گے۔

مجید۔ پھر کیا ہوگا؟

حافظ جی۔ اپنے پرائے محبت کریں گے۔ چار نوکر خدمت کریں گے

سلہ شاعر (خود گم راہ ہوتے ہیں اور گم راہی کی تعلیم کرتے ہیں اور) اُن کی پیروی (بھی) گم راہ (ہی) کرتے ہیں ۱۲

تم فکروں سے چھوٹو گے آرام پاؤ گے۔ اور پھر کوئی کام نہیں کرنا پڑے گا۔

مجید۔ تو میں تو اب بھی کوئی کام نہیں کرتا اور نہ مجھے کسی بات کی فکر ہے

(۲۶۱) ایک صاحب بہادر جو پادری تھے لیمپ خریدنے ایک حاجی صاحب کی دکان پر گئے اور ایک لیمپ کی قیمت دریافت کی۔ حاجی۔ ساڑھے پانچ روپئے ہوں گے۔

پادری۔ (جس میں کسی قدر مذاق تھا) دیکھو حاجی صاحب اتنا جھوٹ مت بولو۔ دوزخ میں جاؤ گے۔

حاجی (جو حاضر جواب تھے) حضور میں وہیں سے آرہا ہوں۔ داروغہ صاحب نے مجھے دوزخ میں گھسنے نہیں دیا اور مار مار کر دھکے دے کر نکال دیا کہ جاؤ کوئی کالا آدمی اس میں نہیں جانے گا۔ یہ جگہ صاحب لوگوں کے واسطے ہے۔

(۲۶۲) ایک پادری صاحب ایک جگہ کھڑے ہو کر پبلک کے سامنے مذہبی تبلیغ کر رہے تھے۔ پاس ہی ایک تھکا ہوا بساطی اپنی گٹھری سے سہارا لگائے اونگھ رہا تھا پادری صاحب نے ایک مرتبہ جوش میں آکر سامعین سے بآواز بلند دریافت کیا بہشت کی کیا قیمت ہے؟

بساطی (چونک کر) ساڑھے پانچ آنے درجن۔

(۲۶۳) میم صاحب (دکان دار سے) ذرا دیکھو یہ چھتری چھوٹا معلوم ہوتا ہے۔
دکان دار۔ تو حضور ایک اور لیجئے۔

(۲۶۴) بیٹی۔ ان کے (شوہر) بغیر بڑی طبیعت گھبراتی ہے۔ ایک دن الگ رہنا دوبھر ہو جاتا ہے۔
ماں۔ ہے بیٹی ایسی تجھے میاں سے محبت ہے؟
بیٹی۔ نہیں اماں۔ محبت وحبت تو نہیں ہے۔ جب وہ سامنے ہوتے ہیں۔ تو مجھے خرچ میں تنگی نہیں ہوتی۔

(۲۶۵) مسافر۔ ذرا سا کھانا ہے۔ اس سے ایک بچے کا بھی پیٹ نہیں بھرے گا۔ میں یہ نہیں کھا سکتا۔ کیسے میلے برتن ہیں اور ملازم بھی بڑے گستاخ ہیں۔ میں یہاں نہیں ٹھیر سکتا۔
مالکِ ہوٹل کدھر ہے؟
ملازم۔ صاحب وہ اس وقت نہیں مل سکتے۔ وہ دوسرے ہوٹل میں کھانا کھانے گئے ہیں۔

(۲۶۶) اگر قرض لینا چاہتے ہیں تو کسی مُردہ دل سے قرض لینا چاہیئے۔ مُردہ دل سے کیوں؟
اس واسطے کہ وہ روپیہ پھر کبھی واپس ملنے کی اُمید نہیں کرتا۔

(۲۶۷) ملزم (اقرار جرم کرنے کے بعد) دیکھیئے حضور مجھے تھوڑے دنوں کی سزا دیجیے۔
مجسٹریٹ۔ کیوں۔ کیا بال بچّوں کی فکر ہے؟
ملزم۔ جی نہیں۔ بلکہ خفیہ پولیس کی جو میری وجہ سے روزگار میں لگے رہتے ہیں۔

(۲۶۸) نوجوان۔ میں آپ کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔
کیا اس خیال سے تم میری بیوی سے ملے ہو؟
نوجوان۔ ہاں میں اُن سے بھی ملا ہوں لیکن شادی تو تمہاری بیٹی سے ہی کرنا چاہتا ہوں۔

(۲۶۹) کسی شاعر نے سکندر کو آزردہ کر دیا جس پر اسے خارج البلد کر دیا اور اُس کا مال و اسباب دوسرے شعراء کو بانٹ دیا۔ کسی نے سبب پوچھا۔ سکندر نے کہا کہ شاعر نے جو جرم کیا تھا اُس کی سزا میں میں نے اُسے شہر بدر کیا اور مال اُس کا شاعروں کو اس لیے دیا کہ اُس کی سفارش نہ کریں۔

(۲۷۰) کسی فیلسوف نے گناہوں سے توبہ کی مگر اُسی وقت ڈاڑھی کا صفایا کر دیا۔ لوگوں نے پوچھا "یہ کیا کیا؟" کہا زمانۂ معصیت میں نکلی تھی۔

(۲۷۱) ایک شخص نے قاضی کے سامنے آکر ایک دوسرے شخص پر دعویٰ کیا۔ قاضی نے گواہ طلب کیے۔ مدعی نے ایک مسخرے کو آگے بڑھا دیا۔ قاضی نے پوچھا تم کچھ مسئلے مسائل بھی جانتے ہو؟" کہا اتنے بہت کہ جن کی شرح مشکل ہے" پوچھا قرآن پڑھتے ہو؟ کہا دس قرأت سے (حالاں کہ قرأتیں سات ہی ہیں) پوچھا کبھی مردے کو غسل بھی دیا ہے؟ کہا "یہ تو میرے باپ دادا کا پیشہ ہی ہے" قاضی نے پوچھا کہ "مردے کو غسل دے کر اور کفنا کر جب تابوت میں رکھتے ہو تو کیا کہتے ہو؟ بولا میں مردے سے کہتا ہوں کہ اچھا ہوا کہ تو مر گیا اور مر کر سستا چھوٹ گیا کہ تجھے قاضی کے پاس جاکر گواہی نہ دینی پڑی۔

(۲۷۲) ایک سائیس اپنے آقا کا گھوڑا دریا پر نہلانے گیا گھوڑے کا پاؤں جو رپٹا کنڈ میں گر کے ڈوب گیا۔ سائیس نے آکر مالک کو خوش خبری دی کہ آپ کا گھوڑا پانی میں فرار ہو گیا۔ مالک بہت خفا ہوا کہا چل میں دیکھوں تو نے گھوڑا کیسے ڈبو دیا تو ذرا میری تلوار باڑھ دار سے لے۔ دریا پر جاکر آقا نے پوچھا گھوڑا کہاں ڈوبا ہے؟" سائیس نے تلوار دریا میں پھینک کر کہا "یہاں ڈوبا" گھوڑا تو ڈوبا تھا تلوار بھی گئی۔ یک نہ شد دو شد۔

(۲۷۳) ایک شخص **مرزا جیون** نامی شاہجہاں آبادی **شاہِ اودھ** کے ہاں لکھنؤ میں بزمرۂ سواران ملازم تھے۔ حضور کی سواری کے ساتھ **نشاط باغ** کو سوار ہوگئے اور جاتے جاتے نوکر سے کہہ گئے کہ ہمارے واسطے بھونی کھچڑی طیّار کرکے جلد لانا۔ نوکر نے مونگ کی دال اور چاول بھڑبھونجے کے ہاں بھنواکر بادیے میں رکھ کر اوپر سے گھی اور پیاز داغ کرکے مع گرم مسالا ڈال ڈول لے کر پہنچا۔ آقا نے جو دیکھا کہ بہت جلد کھچڑی پکا لایا تعجب کیا دسترخوان کھول کر دیکھتے ہیں تو کچّی کھچڑی نیچے بیٹھی ہے اوپر سے گھی پر گرم مسالا اور پیاز کائی کی طرح تیر رہا ہے۔ مرزا صاحب نے کہا ارے **الٰہی بخش** یہ کھچڑی تو نے کیسی پکائی ہے۔ بالکل کچّی ہے میاں

نوکر۔ حضور! دو بار لوے سے بھنوائی ہے اب بھی کچّی ہے تو خدا کی مرضی۔

(۲۷۴) ب۔ بھلا میری جدائی میں تمہیں بھی کچھ خیال ہوتا ہے؟

ہ۔ مجھے تو اس خیال پر ہنسی آتی ہے کہ میری جدائی میں تم خوب پریشان ہوگے۔

(۲۷۵) الف۔ تمہاری گائے کتنا دودھ روزانہ دیتی ہے؟

ب۔ چار سیر۔

الف۔ اور تم کس قدر فروخت کرتے ہو؟

ب۔ چھ سیر

(۲۷۶) رضیہ کے پاس ایک اکنی تھی۔ وہ کہیں گر گئی۔ بے چاری لڑکی ماں کے خوف سے رونے لگی اسی اثنا میں ایک نیک دل آدمی وہاں سے گزرا۔ اور لڑکی کو روتے دیکھ کر وجہ دریافت کی۔ اُس نے کہا میری اکنی کہیں گر گئی ہے۔ اس نیک دل نے لڑکی کو اپنے پاس سے اکنی دے دی۔ لڑکی نے اکنی ہاتھ میں لے کر کہا کہ "تم بڑے چالاک ہو۔ تمہیں نے میری اکنی چرائی تھی۔"

(۲۷۷) مجید گھر کی نچلی منزل میں بیٹھا ہوا سبق یاد کر رہا تھا۔ اسی اثنا میں اُس کے والد کا دوست حمید آیا اور دریافت کیا کہ تمہارے والد گھر میں ہیں؟ مجید نے جواب دیا "کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں اپنے شوق سے پڑھ رہا ہوں؟"

(۲۷۸) ایک بُوڑھی عورت ریل گاڑی میں سوار ہوئی۔ جب گاڑی چلنے کا وقت آیا تو اُس نے گارڈ سے دریافت کیا۔ کہ راستے میں گاڑی کہیں ٹکرائے گی تو نہیں؟

گارڈ نے جواب دیا۔ امّاں جان! گھبراؤ نہیں گاڑی کے ٹکرانے کا مطلق امکان نہیں ہے۔

بُڑھیا نے کہا۔ ہاں بیٹا۔ گاڑی کو احتیاط سے چلانا میرے پاس دو درجن انڈے ہیں۔ ڈرتی ہوں کہیں یہ ٹوٹ نہ جائیں۔

(۲۷۹) کسی شادی کی تقریب میں اپنے والدین کے ساتھ حامد بھی شریک ہوا ہنسی کے طور پر اُس سے دریافت کیا گیا۔ کہ "تم بڑے ہو جاؤ گے تو کس قسم کی عورت سے شادی کروگے؟"

حامد نے جواب دیا کہ "میں شادی نہیں کروں گا" کیوں؟ "میں کئی برس سے شادی شدہ لوگوں میں رہتا سہتا ہوں مجھے شادی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

(۲۸۰) اُستاد نے اپنی جماعت کے ایک لڑکے سے دریافت کیا کہ "اوسط کسے کہتے ہیں؟"

لڑکے نے فوراً جواب دیا "جس میں مرغی انڈے دیتی ہے" جواب سُن کر اُستاد کو بہت غصّہ آیا۔ اُس نے دریافت کیا کہ "تم کو یہ کس نے سکھایا ہے؟"

لڑکا ہوشیار تھا۔ کتاب کھول کر اُستاد کے سامنے رکھ دی اُس میں لکھا تھا کہ "مرغی اوسط میں بیس اکیس انڈے دیتی ہے"

(۲۸۱) ایک بھکاری روٹیاں چُرانے کے الزام میں عدالت میں پیش ہوا مجسٹریٹ نے گواہوں کی شہادتیں قلمبند کرنے کے

بعد تین دن کی سزائے قید دے دی جب حکم سُنایا گیا۔ تو بہکاری نے آبدیدہ ہوکر مجسٹریٹ سے کہا "حضور جہاں آپ مجھے بھیج رہے ہیں۔ اگر وہاں روٹی کا سہارا ہوجائے تو تین دن کے بجائے میں تین مہینے تک رہنے کے لیئے تیار ہوں"

(۲۸۲) بغداد میں ایک شخص تھا جس کا بال بال قرض دار تھا دینا دلانا جانتا ہی نہ تھا سب لوگ جمع ہوکر قاضی کے پاس فریاد کو گئے۔ قاضی نے حکم دیا کہ اسے گدھے پر سوار کرکے صبح سے شام تک سارے دن پھراؤ اور منادی کرادو کہ کوئی شخص اس نادہند کو دمڑی تک قرض نہ دے اور شام کو گھر جاکر پہنچادو اور اُجرت گدھے کی اس سے لے کر گدھے والے کو دی جائے۔ غرض اسے سارے شہر میں پھرایا، شام کو گھر پر لاکر چھوڑا۔ آپ گدھے پر سے اُترے۔

گدھے ولے نے کہا اُجرت دلواؤ۔ وہ ہنسا اور کہا کہ تو بڑا احمق ہے۔ آج صبح سے شام تک ہم کس کام میں تھے اور تو نے منادی بھی سُنی اور پھر بھی نہ سمجھا۔ کیا تیری عقل پر پتھر پڑے ہیں

(۲۸۳) ایک شخص قاضی کے پاس گئے کہ دیکھیئے فلاں شخص مجھے کہتا ہے کہ گوست کھاؤ" قاضی نے کہا وہ جھک مارتا ہے تم شوق

سے کھاؤ وہ منع کرنے والا کون ؟۔

(۲۸۴) ایک فقیہ گلی میں سے چلے جا رہے تھے اتفاقاً پرنالے میں سے گندے پانی کے چند قطرے ان کے سر پر گرے اوپر نگاہ اٹھا کر دیکھا، ایک عورت بیٹھی پیشاب کر رہی تھی۔ فقیہ نے کہا، کیا خوب تو نے تو میرے سارے کپڑے گندے کر دیئے" عورت بولی "میاں صاحب کچھ مضائقہ نہیں کہ دہ در دہ حوض کا پانی پاک ہوتا ہے"

(۲۸۵) دکان دار۔ اب تو آپ نے سارے کمبل دیکھ لیئے فرمایئے کون سا کمبل پسند ہے؟ بیگم صاحبہ۔ میں ایک دوست کے ملنے کی منتظر تھی، خریداری مقصود نہ تھی۔ دکان دار۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ آپ کے دوست کسی کمبل میں چھپے بیٹھے ہیں تو صرف ایک کمبل رہ گیا ہے وہ بھی آپ کی خاطر اُتارے لیتا ہوں۔

(۲۸۶) چچا۔ میری پیٹھ پر سوار ہونے میں تمہیں خوشی ہوتی ہے؟ بھتیجی۔ نہیں چچا جان۔ میں اصلی گدھے پر بھی سوار ہو چکی ہوں۔

تمت

حصۂ دوم ختم ہوا حصۂ سوم ملاحظہ فرمایئے۔

ذی قعدہ ۱۳۴۳ھ　　(رشحۂ قلم خاکسار محمد انوار اللہ شاہ)　　جون ۱۹۲۵ء

ھندوستان الیکٹرک پرنٹنگ ورکس دہلی

میرے والد ماجد مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم و مغفور کی تصانیف

نمبر	نام کتاب	غیر مجلد	مجلد	محصول
۱	۲			
	مولوی نذیر احمد صاحب کا ترجمہ کلام مجید اردو کا بہترین ترجمہ مان لیا گیا ہے جس کی قریب قریب ایک لاکھ کاپیاں اب تک ہدیہ ہو چکی ہیں۔ کلام مجید کا ترجمہ مختلف تقطیع پر چھپا ہے جس کی صراحت ذیل میں ہے۔			
۱	بڑا قرآن شریف۔ جلی قلم۔ کاغذ سفید عمدہ چکنا ولایتی سطور پر حنائی رنگ صفحہ ۹۶۷ تقطیع ۲۲×۲۹ دو صفحہ مع فہرست مضامین فرہنگ الفاظ اردو	عـہ	چرمی جلد ؏	۱۰/عـہ
۲	جامع المصاحف متوسط قرآن تقطیع ۲۲×۲۹ چو صفحہ صفحہ ۸۰۰ کاغذ سفید چکنا ولایتی سطور پر حنائی رنگ با ترجمہ اردو مع فہرست مضامین و فرہنگ الفاظ اردو۔	صہ/	معہ	۱۴/
۳	غرائب القرآن تقطیع ۲۲×۲۹ صفحہ ۱۱۴۸ اس میں ایک طرف کلام مجید ہے صفحہ مقابل پر ترجمہ حاشیہ پر حل لغات عربی۔ کاغذ حنائی اور سفید دو قسم کا ہے کاغذ سفید صمہ۔ کاغذ حنائی و بیز للعہ	صمہ و للعہ	بمہ/	۸/
۴	حمائل شریف ترجمہ بین السطور۔ سطور پر حنائی رنگ تقطیع ۲۲×۱۴ صفحہ ۱۰۶۴ مع فہرست مضامین و فرہنگ لغات اردو سفر میں ساتھ رکھنے کے قابل ہے۔	للعہ	صمہ/	۸/
۵	سورۃ فی احسن الصورۃ۔ مترجم پنج سورہ کی جگہ یہ وہ سورہ			

۲ وظیفہ پڑھنے والوں کے لیے بہت ضروری۔ تقطیع ۱۶×۲۲ صفحہ ۱۴۴ قیمت ۱۰/ محصول ۲/

نمبر	نام کتاب	غیر مجلد	محصول
۱	۲	۳	۴
۲۰	چند پند۔ مفید و نصیحت آمیز مختلف مضامین کا مجموعہ بچوں کے لیے تقطیع ۲۰×۲۶ صفحات ۷۲ ۔	۸/	۳/
۲۱	صرف صغیر۔ اردو زبان میں فارسی گرامر تقطیع ۲۰×۲۶ صفحہ ۴۴	۴/	۳/
۲۲	نصاب خسرو۔ جدید طرز کی خالق باری تقطیع ۲۰×۲۶ صفحہ ۲۸	۶/	۳/
۲۳	رسم الخط۔ املا نویسی کے قواعد لڑکوں کے لیے بہت ضروری تقطیع ۲۰×۲۶ صفحہ ۳۲	۶/	۳/
۲۴	مبادی الحکمۃ۔ سلیس اردو میں عربی منطق کے قواعد تقطیع ۲۰×۲۶ صفحہ ۱۳۲	۸/	۴/
۲۵	مالیغنیک فی الصرف۔ صرف عربی کی بہترین گرامر اردو میں تقطیع ۲۲×۲۹ صفحہ ۴۸	۱۲/	۴/
۲۶	لکچروں کا مجموعہ۔ دو جلدوں میں تقطیع ۲۰×۲۶ صفحہ ۱۹۱ جس (۴۴) لکچر ہیں دونوں جلد	[illegible]	۱۴/
۲۷	مطالب القرآن۔ قرآن شریف کی تفسیر کا پہلا حصہ جتنا لکھا جا چکا تھا۔ چھاپ دیا گیا۔ تقطیع ۲۲×۲۶ صفحہ ۱۴۸	[illegible]	۵/
۲۸	امہات الامہ۔ ازواج مطہرات کے حالات (زیر طبع)	[illegible]	۵/

میری ناچیز تصانیف

اقبال دلہن ۔ حسن معاشرت۔ اصلاح معیشت۔ بخت جگر دو حصے۔ فغان اشرف؛ یہ پانچوں کتابیں
[illegible] مجلد [illegible] ۵/ ۔ [illegible] مجلد [illegible] ۵/ ۔ [illegible] مجلد [illegible] ۵/ ۔ [illegible] مجلد [illegible] ۱۱/ ۔ [illegible] ۵/

۱۸×۲۲ تقطیع کی مراۃ العروس کی طرز کی ہر عمر کی عورتوں کے لیے ان میں سے نمبر ۲، ۳، ۴ و ۵ پر گورنمنٹ سے انعام بھی ملا ہے۔ نیک کرداری کی کتابیں۔ حرز طفلاں بچوں کے لیے۔ نشاط عمر جوانوں کے لیے
[illegible]

عصائے پیری عمر رسیدہ لوگوں کے لئے ۔ شمع ہدایت سب کے لئے ۔ بچیوں کے دودیا میں لڑکیوں کے لئے

۱۲ عہ - ۲ر عہ ۵ر عہ - ۲ر

۱۱ مثنوی دردِ دل ۔ سچا اور دردناک واقعہ ۔ قیمت ۸ ۔ ۲ر ۱۲ عزم بالجزم ۔ استقامت ارادہ پر ایک

دلچسپ قصّہ ۱۳ دیوانِ بشیر ۔ مع مصنف کے فوٹو اور (۲۲۱) دلچسپ نظموں کے قیمت مجلد

۱۴ انشائے بشیر جس میں نہایت بکار آمد تشو خطہیں عورتوں کے لئے ۔ ۲ر - ۳ر عہ عاہ

۱۵ تاریخ بیجاپور (دکن کی مکمل تاریخ) مع (۲۰) فوٹو ۳ حصّے عہ مجلد عا - ۸ر

قیمت ہے مجلّد ہے ۔ محصول ۸ر ۔ ۱۶ تاریخ دہلی ۔ تین حصّے ۔ قدیم زمانے

سے آج تک کی تاریخ قابلِ دید فوٹو (۹) عمارتوں کے قلمی نقشے (۲۰۹) ہے مجلد عا

۱۷ لطائفِ عجیبہ ۔ نہایت عمدہ عمدہ لطیفے تین حصوں میں ۔ قیمت فی حصّہ عہ محصول ۵ر

۱۸ حکایاتِ لطیفہ ۔ نہایت عمدہ عمدہ دلچسپ کہانیاں تین حصوں میں فی حصّہ عہ محصول ۵ر

۱۹ فرامینِ سلاطین جس میں چند فرمانوں کے فوٹو بھی ہیں قیمت عہ محصول ۵ر (زیرِ طبع)

اگر لطائفِ عجیبہ اور حکایاتِ لطیفہ کا پورا سٹ لیں تو قیمت میں فی سٹ آٹھ آنے رعایت کی جائے گی۔

۲۰ تمثال امثال (زیرِ طبع) محاورات ۔ مثلوں ۔ پہیلوں ۔ چیستانوں ۔ دوہوں کی نہایت

شرح وبسوط لغت دو جلدوں میں تخمینی قیمت ہے یا ہے

ملنے کا پتہ

بشیر الدین احمد تعلقہ دار کھاری باؤلی ۔ دہلی